مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(حیات اور علمی خدمات)

ڈاکٹر کلیم ضیا

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(حیات اور علمی خدمات)

ڈاکٹر کلیم ضیا

کتاب کا نام : مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (حیات اور علمی خدمات)
مصنف کا نام : ڈاکٹر کلیم ضیا
پتہ : 5 - 22/Q ، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی ۔۴۰۰۰۴۳
ناشر : ڈاکٹر کلیم ضیا
مطبع : سلمان فائن آرٹس، مومن پورہ، ناگپور
کمپوزر : محمد رفیع الدین
کمپیوٹر کمپوزنگ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور
سالِ اشاعت : ۲۰۰۴ء

MOULANA HABIB -UR- RAHMAN AAZMI
(Hayat Aur Ilmi Khidmaat)
By Dr. Kaleem Zia

Price: Rs. 100/- قیمت : ۱۰۰ روپے

-----ملنے کا پتہ-----
ڈاکٹر کلیم ضیا
5 - 22/Q ، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی ۔۴۰۰۰۴۳
فون نمبر: ۲۵۵۸۹۰۷۱، موبائل: ۹۸۲۰۷۸۶۸۵۴

بڑے بھیّا

مرحوم محمد سلیم مقیم

کے نام

جن کے تدبر نے میرے تابناک مستقبل
کی راہیں ہموار کیں۔

ربِّ کریم
انھیں غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین

شناس نامہ

نام	:	محمد کلیم
قلمی نام	:	کلیم ضیا
پتہ	:	5 - 22/Q ،شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی۔۴۰۰۰۴۳
والد کا نام	:	محمد مقیم
تاریخ پیدائش		۴ مارچ ۱۹۵۶ء

تعلیم	:	ایم اے (اردو)	ممبئی یونیورسٹی، ممبئی
		ایم اے (فارسی)	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
		ایم اے (عربی)	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
		پی ایچ ڈی (اردو)	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور

ملازمت :

☆ ۴جنوری ۱۹۷۷ء سے ۱۷جون ۱۹۸۵ء تک ممبئی کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔

☆ ۱۸جون ۱۹۸۵ء سے ۷مئی ۱۹۹۵ء تک وسنت راؤنائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور میں اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

☆ ۸مئی ۱۹۹۵ء سے تاحال اسمٰعیل یوسف کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، ممبئی میں اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

☆ ۱۶جنوری ۱۹۹۹ء سے مزبورہ کالج میں صدر شعبۂ اردو کے منصب پر فائز ہیں۔

اعزازات:

☆ چیرمین، بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

☆ چیئرمین مسلم گریجویٹ فورم مہاراشٹر

☆ نائب صدر ممبئی لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی، ممبئی

☆ سکریٹری یونائیٹیڈ مسلم فورم، ممبئی

☆ جوائنٹ سکریٹری آئیڈیل ایجوکیشنل موومنٹ، ممبئی

☆ ممبر انجمن ترقی اردو (ہند)، مہاراشٹر

☆ جوائنٹ ایڈیٹر سہ ماہی اسباق، پونہ

فہرست

اعتراف ۹-۱۰

حالات وکوائف ۱۳-۵۶

علمی خدمات

شاعری

مشاہیر کی نظرمیں

کتابیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعتراف

میں ناگپور میں بسلسلۂ ملازمت دس سال مقیم رہا۔ یہ سرزمین میرے لیے اس قدر مبارک نکلی کہ یہیں رہ کر میں نے فارسی اور عربی سے ایم اے اور اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ گویا میں نے اپنی تین اعلا اسناد یہیں رہ کر حاصل کیں جو میری ترقی میں بے انتہا معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔

میرا تقرر ۱۸ جون ۱۹۸۵ء کو وسنت راؤ نائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ یہاں مجھ کو جو سنجیدہ علمی ماحول ملا اسی نے میرے تحصیل علم کے جذبے کو از سرِ نو جلا بخشی اور میرے علمی ذوق و شوق کو تقویت پہنچائی۔ میں ڈاکٹر سید عبدالرحیم کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جنہوں نے میری علمی شخصیت کو نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے لیے میں ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ڈاکٹر انیق الرحمٰن، پروفیسر محی الدین اطہر، پروفیسر معز الدین فاروق اور ڈاکٹر عباس علی کا بھی ممنون و مشکور ہوں جن سے کالج میں میرے گہرے مراسم رہے۔ ان مراسم نے مجھ کو عزم و حوصلے کی دولت سے سرفراز کیا۔

زیر نظر کتاب دراصل ۱۹۹۵ء میں اس وقت ضبط تحریر میں آئی تھی جب میں ناگپور یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کر رہا تھا۔ ایم اے سال دوم کا چوتھا پرچہ

Dissertation پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے اس کے لیے علمِ حدیث کے اس زبردست عالم کو منتخب کیا اور تین ماہ کے عرصے میں پچہتر صفحات کا مختصر مقالہ لکھ کر نا گپور یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ جب گزشتہ سال اس کی اشاعت کا خیال آیا تو میں نے اس کے مسودے پر نظر ثانی کی، چنانچہ ترمیم واضافے کے بعد اس نے موجودہ صورت اختیار کی۔ اب یہ اہل علم کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے یقین کہ محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے حالات وکوائف اور ان کے علمی کارناموں سے وہ ضرور استفادہ کریں گے۔

یہ کتاب ہرگز درجۂ تکمیل کو نہ پہنچتی اگر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل صاحب مجھ کو مواد فراہم نہ کرتے۔ موصوف نے دل کھول کر تعاون کیا۔ اس کے لیے میں ان کا رسمأ نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ خدا ان کی عمر دراز کرے اور انھیں صحت وتندرست رکھے تا کہ وہ علمی کام کرنے والوں کی معاونت کرتے رہیں۔

ممبئی

احقر

۳ مارچ ۲۰۰۴ء

کلیم ضیا

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(حیات اور علمی خدمات)

حالات وکوائف

بیسویں صدی میں برِ صغیر کے علمی و دینی حلقوں کو جن جیّد علمائے کرام نے متاثر کیا ان میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ موصوف کی پوری زندگی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور حدیث وتفسیر وفقہ کی خدمت میں بسر ہوئی۔ متعدد علما نے ان سے اکتسابِ فیض کیا اور ان سے سندِ حدیث لینے کے لیے بیرونِ ملک کے کئی علما نے ہندوستان کا سفر کیا۔ علمی دنیا میں موصوف کی شہرت ومقبولیت بہت تھی۔ عرب سے عجم تک علمِ حدیث میں ان کی زبردست مہارت کا چرچا تھا۔ ان کی علمی شخصیت کے متعلق مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی (مفتی دارالعلوم، دیوبند) اپنے احساسات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں: (۱)

"مولانا کی ذات دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی تھی۔ علم حدیث اور فن اسماء الرجال سے انھیں خاص شغف تھا۔ پوری دنیائے اسلام میں خادمِ حدیث کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور عرب وعجم میں جو علمائے کرام حدیث سے ذوق رکھتے تھے وہ دور دراز سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے حدیث کی اجازت وسند حاصل

کرتے .... قلمی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی۔ آپ نے
بہت سی کتبِ حدیث کا قلمی نسخہ مختلف کتب خانوں سے حاصل
کیا۔ ان پر محنت کی اور اپنی تحقیق و تعلیق سے انھیں مزین فرمایا۔''

اسی طرح حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی لکھتے ہیں: (۲)

''بیسویں صدی میں حضرت امیر الہند قدس سرہٗ علم کی صفوں میں
اور علم و تحقیق کے میدان میں بالخصوص فن حدیث اور اس کے
متعلقات میں جس درجہ اہمیت کے حامل تھے اسے سب جانتے
ہیں۔ ...... ان کی خدمات کا دائرہ اس صدی کے تین چوتھائی
حصہ پر محیط ہے۔ ان کی بارگاہِ علم میں عرب و عجم نے زانوئے
ادب تہہ کیا ہے اور اخیر دور میں شدید ضعیف اور بڑھاپے کے
باوجود نہایت نازک حالات میں ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ
کی سربراہی جس طرح آپ نے فرمائی ہے وہ ایک یادگار اور
قابلِ فخر کارنامہ ہے۔''

اس محدث جلیلِ اور زبردست عالم کے علم و فضل کا احاطہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں
ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا ہے میں نے ان کے حالات و کوائف مختلف ذرائع سے
حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی تصنیفات و تالیفات کو پیشِ نظر رکھ کر ان پر
روشنی ڈالنے کی ناچیز سعی کی ہے۔

خاندان:

منوناتھ بھنجن (اترپردیش) اپنی علمی زرخیزی اور شادابی کے لحاظ سے ایک نمایاں
حیثیت رکھتا ہے۔ اس سرزمین سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے ہیں جن کے علمی و
تحقیقی کارناموں پر ملت اسلامیہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ یہ علاقہ تاریخ میں علم و فضل

کی روشنی سے منور نظر آتا ہے۔ اسی کو محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے وطنِ مالوف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے جد اعلا کا نام خوشحال تھا جو مئو سے تقریباً سات آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ایک مشہور قصبہ ''ادری'' سے ترکِ وطن کر کے مئو آئے تھے اور محلہ پٹھان ٹولہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ خوشحال کے بیٹے عنایت اللہ تھے جن کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ وہ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) تک بقید حیات تھے۔ (۳)

عنایت اللہ کے بیٹے محمد صابر تھے جو مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے والد محترم تھے۔ موصوف کا شمار نامور علما میں تھا۔ وہ اپنے زہد و تقویٰ اور اخلاق و فضائل کے اعتبار سے بلند مرتبہ تھے۔ انھوں نے علوم و فنون کی تحصیل مولانا عبدالغفار عراقی، مولانا ابوالحسن عراقی اور مولانا ابوالبرکات سے مدرسہ احاطہ مولانا شاہ محمد عمر میں کی اور مولانا ابوالحسن سے صحاحِ ستہ پڑھ کر ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں سندِ فراغت حاصل کی۔ تحصیلِ علم کے بعد علما و صلحا کے طریقے کے مطابق علومِ دینیہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے اور تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلّہ کی مسجد میں جوانوں کو فارسی اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں متعدد تشنگانِ علم نے ان سے استفادہ حاصل کیا۔ وہ مولانا ابوالحسن عراقی کے دورِ نظامت میں مدرسہ مفتاح العلوم، مئو کے نائب ناظم اور خازن رہے۔ ان گوناگوں علمی و دینی خدمات کے علاوہ احسان و سلوک میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔ ان کے شیخ و مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، انھیں بڑی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ بڑا حسنِ ظن رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ مولانا حبیب الرحمن کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا محمد صابر نے ان کے ذریعہ ایک رومال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا حبیب الرحمن نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے عرض کیا کہ والد صاحب نے یہ ہدیہ میں پیش کیا ہے۔ یہ سنتے ہی موصوف نے سر پر رکھ کر فرمایا کہ یہ آپ کے والد کا ہدیہ نہیں تبرک

ہے۔اہلِ مئو مولانا کی اس خصوصیت کا تذکرہ عام طور سے کرتے ہیں کہ ابتدا بالسلام کی سنت پر مولانا اس شدت کے ساتھ عمل پیرا تھے کہ کوشش کے باوجود بھی کوئی ان سے سلام میں سبقت نہیں لے جاتا۔خود مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنے والد کے متعلق ایک بیاض میں اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا ہے: (۴)

''اس فقیر کے پدر بزرگوار اور ولی نعمت، سند یافتہ عالم اور مولانا عبدالغفار صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد اور سلسلہ چشتیہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید تھے۔ حد درجہ پابند شریعت، خداترس، دنیا بے زارؒ، تہجد گزار، مہمان نواز اور خوش اخلاق تھے۔ بہت زیادہ گریہ وزاری اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: (۵)

''میرے والد اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علما میں تھے۔اپنی نیکی اور پارسائی، پابندِ تلاوت اور ذکر واذکار کے باعث عوام وخواص سب میں مشہور تھے۔عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مسلم وغیر مسلم سب ان کے عقیدت مند تھے۔فقہ وتفسیر کا درس مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں حاصل کیا اور انھی کے پاس صحاحِ ستہ حرفاً حرفاً پڑھی اور محدث ومفسر وفقیہہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے ذکر سیکھا۔'' (عربی سے ترجمہ)

مولانا محمد صابر پاک باطن، خوش گفتار، نیک کردار اور سادہ مزاج تھے۔مزدوروں کا پسینہ سوکھنے سے پہلے مزدور کی اجرت دے دیتے۔وسیع القلب تھے اس لیے ذات پات کی تفریق کے قائل نہیں تھے۔مطالعہ کے بیحد شوقین تھے۔ذکرواذکار میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتے تھے۔ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس وتدریس میں گزرا۔انھوں

نے ۷۳ سال کی عمر میں ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) کو مئو میں رحلت فرمائی اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی والدہ کا نام کلثوم تھا۔ وہ قاسم پورہ مئو کے ایک متوسط الحال شخص عبدالرحیم کی صاحبزادی تھیں۔ نیک سیرت، پاکیزہ خیال اور خوش اخلاق تھیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن اپنی والدہ کی سیرت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: (۶)

> "مرحومہ خاتونِ خانہ تھیں۔ صرف ضرورت کے بقدر گھر سے نکلتی تھیں۔ جیسے بستی یا رشتہ دار کی کسی عورت کی عیادت کرنی ہو یا اپنے بھائی یا اپنی دونوں لڑکیوں میں سے کسی سے ملنے جانا ہو۔ نماز، روزے کی نہایت پابند، کم گو اور خاموش طبع تھیں۔"

اس نیک بخت خاتون کا بروز اتوار، ۶ رجب ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۴ء) کو انتقال ہوا اور اپنے شوہر کے پہلو میں دفن ہوئیں۔

ولادت:

مولانا حبیب الرحمٰن ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں مئو میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ دارالعلوم، دیوبند کے مرتب سید محبوب رضوی نے ان کا سالِ پیدائش ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) بتایا ہے۔ (۷) یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ان کا تاریخی نام اختر حسن تھا۔ اس نام کے حرفوں کے اعداد ۱۳۱۹ھ ہوتے ہیں۔ ان کا لقب حبیب الرحمٰن اور کنیت ابوالمآثر تھی۔ لیکن وہ لوگوں میں بڑے مولانا کے نام سے بہت مشہور تھے۔ انھوں نے الاعظمی کی نسبت امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ سے متاثر ہو کر اختیار فرمائی تھی۔ (۸)

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کرنے کے بعد مئو سے متصل قصبہ بہادر گنج

کے ایک مدرسہ میں داخلہ لیا۔ اس مدرسہ میں مولانا ابوالحسن عراقی سے عربی کی زیادہ تر کتابیں پڑھیں اور ان سے بھرپور کسبِ فیض کیا۔ وہ ۱۹۱۶ء کے آس پاس مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں داخل ہوئے جہاں مولانا عبدالغفار عراقی سے درسِ نظامی کی کچھ کتابیں پڑھیں لیکن ۱۹۱۷ء میں مظہرالعلوم بنارس آ گئے۔ اس داخلہ کے سلسلے میں خود لکھتے ہیں: (۹)

> ''جب گورکھپور سے ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہو گئے تو میں بھی ان کی خدمت میں پہنچا اور مدرسہ مظہرالعلوم سے ۱۹۱۸ء میں ''ملا'' کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں ''ملا فاضل'' کا امتحان دیا۔

دارالعلوم دیوبند میں:

مظہرالعلوم بنارس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ (جولائی ۱۹۱۹ء) میں پہلی بار بغرضِ تحصیلِ علم حدیث دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا لیکن دیوبند میں فصلی بیماری پھیل جانے کے باعث وہ دو ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی گھر لوٹ آئے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبداللطیف نعمانی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (۱۰)

> ''اس سال بیماری کا بڑا زور تھا۔ (مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا عبدالحی اور مولانا فاروق) کے جانے کے ایک ماہ بعد میں بھی بخار میں مبتلا ہوا۔ میری حالت تشویش ناک دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم، دیوبند نے مولوی یعقوب سکروری کے ساتھ مجھے بھی گھر بھیج دیا۔ کرایہ کے پیسے پاس میں نہیں تھے تو مہتمم صاحب نے دفتر سے قرض دلوا دیا جس کو آنے کے بعد والد صاحب نے ادا کیا۔''

گھر واپس آ کر مولانا حبیب الرحمٰن دسمبر ۱۹۱۹ء سے دو تین ماہ تک بیمار رہے۔ جب صحت یاب ہوئے تو فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں ۱۵ روپے ماہانہ تنخواہ اور کھانے پر ملازمت کی۔ لیکن چار ماہ بعد ہی شوال ۱۳۳۹ھ (جون ۱۹۲۰ء) میں دوبارہ بغرضِ تحصیلِ علمِ حدیث دارالعلوم، دیوبند پہنچے اور دورۂ حدیث میں شرکت کی۔ اس مرتبہ بھی وہ دارالعلوم میں ربیع الاول ۱۳۴۰ھ (نومبر ۱۹۲۱ء) تک ہی رہ سکے۔ ہوا یہ کہ انھیں پھر بخار آ گیا۔ اس کے علاوہ تحریکِ ترکِ موالات کی وجہ سے ملک کے دیگر مقامات کی طرح دیوبند میں بھی زبردست ہنگامہ جاری تھا چنانچہ والد کے حکم پر گھر لوٹ آئے۔ اس سلسلہ میں مولانا خود لکھتے ہیں: (۱۱)

"۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۰ھ کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ تحریکِ موالات بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ دوسرے شہروں کی طرح دیوبند میں طلبہ کے سروں سے ودیشی کپڑوں کی ٹوپیاں اتاری اور جلائی جاتی تھیں۔ انھی ایام میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ دیوبند میں گرفتار ہوئے۔ عصر کے بعد دوشِ آئی مگر ایسا ہنگامہ پیدا ہوا اور آدمیوں کا اتنا ہجوم و اژدہام ہوا کہ اس وقت گرفتاری عمل میں نہ آ سکی۔ مولانا محترم کا قیام حضرت شیخ الہند کے نئے مکان میں اور میرا اور میرے چند ساتھیوں کا قیام حضرت شیخ الہند کے پرانے مکان میں تھا۔ مولانا کے ساتھ ساتھ ہم سب رات بھر پولس اور فوج کے گھیرے میں رہے۔ اس دن ہم بہت دیر میں سوئے تھے۔ صبح کو اٹھے تو معلوم ہوا کہ بہت رات گئے نئے مکان سے مولانا کو گرفتار کر کے لے گئے۔

ان حالات سے والد صاحب بہت مشوش اور پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ وطن واپس ہو جاؤں۔ اسی اثنا میں مجھے اس سال

بھی بخار آ گیا۔ والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم
مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ۔ چنانچہ صفر یا
ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں میں مئو چلا آیا۔"

دارالعلوم میں قیام کے دوران مولانا نے جن جید علما سے استفادہ کیا ان میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید اکبر حسین میاںؒ کے اسمائے گرامی قابلِ احترام ہیں۔ ان حضرات سے انھوں نے بالترتیب جامع ترمذی، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد پڑھی۔

دارالعلوم مئو میں داخلہ:

مولانا حبیب الرحمٰن بخار کی حالت میں مئو آئے تھے۔ جب صحت یاب ہوئے تو تحصیلِ علمِ حدیث کے شوق میں اپنے ہی شہر مئو کے ایک مشہور مدرسہ دارالعلوم کے شعبۂ دورۂ حدیث میں داخلہ لیا۔ یہاں شیخ الحدیث اور صدر مدرس مولانا کریم بخش سنبھلیؒ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر صحاحِ ستہ پڑھی۔ یوں دورۂ حدیث کی باقاعدہ تکمیل کی اور سندِ فراغت و دستارِ فضیلت حاصل کی۔ ان سے اسی زمانے میں معقولات کی اعلا کتابیں بھی پڑھیں جن کا مطالعہ کرنا اس زمانے میں لازمی سمجھا جاتا تھا اور جن کے مطالعہ کے بغیر کسی شخص کا بڑا عالم بننا مشکل تھا۔ حضرت مولانا نے عبداللطیف نعمانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: (۱۲)

"صحت یابی کے بعد (دیوبند سے واپسی پر) اس کے سوا کوئی چارۂ
کار نہ تھا کہ دارالعلوم، مئو میں دورہ کی کتابیں تمام کرلوں۔ خوش
قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی دارالعلوم مئو میں تشریف
لا چکے تھے اور ان کے پاس ہمارے ایک رفیق مولوی عبدالمجید
صاحب دورہ پڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا

اور شعبان ۱۳۴۰ھ (مارچ ۱۹۲۲ء) میں دورۂ حدیث ختم ہوا۔"

چند غلطیوں کی نشاندہی:

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ دار العلوم، دیوبند کے مرتب سید محبوب رضوی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تعلیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں: (۱۳)

"ابتدائی عربی تعلیم اپنے وطن مئو (ضلع اعظم گڑھ) کے مشہور مدرسہ دار العلوم میں ہوئی۔ پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مشہور شاگرد رشید حضرت مولانا عبد الغفار صاحب سے گورکھپور اور بنارس میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ اسی کے ساتھ علومِ مشرقیہ کے مختلف عربی کے امتحانوں میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔ فاضلِ ادب کا امتحان الٰہ آباد سے پاس کر کے ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں دار العلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) کے اوائل تک مظہر العلوم بنارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) کے اواخر میں دوبارہ دار العلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں شرکت کر کے سماعت کی۔"

اس اقتباس میں یہ غلطیاں در آئی ہیں:

۱۔ "۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں دار العلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔"

...... یہ بیان غلط ہے۔

مولانا کے بیان کے مطابق انھوں نے دیوبند میں پہلی بار شوال ۱۳۳۷ھ (جون ۱۹۱۹ء) میں داخلہ لیا اور دو ماہ کے عرصے میں ہی گھر لوٹ آئے۔

۲۔ مولانا نے دورۂ حدیث کی تکمیل دارالعلوم، دیوبند میں نہیں بلکہ دارالعلوم، مئو میں مولانا کریم بخش سنبھلیؒ کی نگرانی میں شعبان ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) میں کی۔

۳۔ ''تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) کے اوائل تک مظہر العلوم بنارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔'' .... یہ بیان بھی غلط ہے۔ ابھی مولانا تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے فروری ۱۹۲۰ء سے جون ۱۹۲۰ء تک فقط چار مہینے ہی مظہر العلوم، بنارس میں ملازمت کی اور اس کے فوراً بعد دارالعلوم، دیوبند کے دورۂ حدیث میں شوال ۱۳۳۹ھ (جون ۱۹۲۰ء) میں دوبارہ شرکت کی۔

جیسا کہ مولانا خود لکھتے ہیں: (۱۴)

> ''بیماری کی وجہ سے اور اس لیے کہ میں نے فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کے لیے پندرہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازمت کر لی تھی۔ اس وقت مدرس سوم عربی کی تنخواہ پندرہ روپے خشک ہوا کرتی تھی۔ شوال ۱۳۳۸ھ میں دیوبند نہیں جا سکا۔ شوال ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ میں نے دیوبند جا کر دورۂ حدیث میں شرکت کی۔''

دارالعلوم مئو میں بحیثیت مدرس:

مولانا حبیب الرحمٰن نے شعبان ۱۳۴۰ھ (مارچ ۱۹۲۲ء) میں دارالعلوم، مئو سے دورۂ حدیث کا تکملہ کیا۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ شوال ۱۳۴۰ھ (مئی ۱۹۲۲ء) میں اسی مدرسہ میں بحیثیت مدرس ان کا تقرر ہو گیا جہاں وہ درجۂ علیا میں ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) تک طلبہ کو اعلا اور معیاری کتابوں کا درس دیتے رہے۔ اسی زمانے میں مشہور و معروف عالم

دین مولانا محمد منظور نعمانی نے ان سے کئی کتابیں پڑھیں اور حضرت مولانا محمد حسین بہاری نے بھی ان سے استفادہ کیا۔

مظہر العلوم بنارس میں بحیثیت صدر مدرس:

مولانا حبیب الرحمٰن دار العلوم، مئو میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ کسی معاملہ پر انتظامیہ سے اختلاف ہوگیا اور وہ ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) میں بنارس چلے آئے جہاں وہ مظہر العلوم میں صدر مدرس کے منصب پر فائز کئے گئے۔ ان کا بنارس میں شوال ۱۳۴۷ھ (مارچ ۱۹۲۹ء) تک مظہر العلوم کے صدر مدرس کی حیثیت سے قیام رہا۔ بعد ازاں یہ ملازمت بھی ترک کردی اور اپنے وطن مئو لوٹ آئے۔ اس ترکِ ملازمت کے متعلق مولانا محفوظ الرحمٰن کو تحریر کردہ خط مورخہ یکم رجب ۱۳۴۷ھ میں لکھتے ہیں: (۱۵)

> ''آپ کے دو خط مجھے ملے۔ آپ کی شکایت ایک حد تک بجا ہے کہ جواب میں تاخیر ہوئی مگر اس کا جو سبب آپ نے تجویز کیا ہے وہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ بنارس میں بعض ارکانِ مدرسہ کی بعض حرکتیں مجھے ایسی ناپسند ہوئیں کہ میں نے وہاں اپنا قیام کسی طرح مناسب نہیں سمجھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مکان جا کر استعفا روانہ کردوں کہ چھوٹے بھائی محمد کی علالت کی خبر پہنچی۔ میں نے دو روز کی رخصت لی اور مکان پہنچ گیا اور دوسرے دن استعفا روانہ کردیا۔''

مفتاح العلوم، مئو سے وابستگی:

مفتاح العلوم، منو کی ایک قدیم دینی درس گاہ ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد مولانا ابو الحسن عراقی کے دستِ مبارک سے ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں رکھا گیا۔ یہاں سے نمایاں علما و فضلا

سندِ فراغت حاصل کر کے نکلے اور علم و ادب کی بے بہا خدمات انجام دیں۔
بنارس سے مئو آجانے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن اسی مقتدر درس گاہ سے اپنے اساتذہ اور چند طلبہ کے اصرار پر وابستہ ہوئے۔ یہاں انھیں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کا منصب عطا کیا گیا۔
انھی کے دور میں حدیث کی تعلیم سے مفتاح العلوم کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور یہاں دورۂ حدیثِ نبوی کا آغاز ہوا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے حسنِ انتظام کے باعث تعمیر و ترقی کے لحاظ سے بھی مدرسہ شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا خود لکھتے ہیں: (١٦)

"جب میں بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرارِ تمام مدرسہ مفتاح العلوم میں لا کر بٹھا دیا۔ دو ماہ بعد مولانا عبداللطیف صاحب جب عید الاضحیٰ کی تعطیل میں سنبھل سے مئو آئے تو میں نے ان کو بھی روک لیا۔ مفتاح العلوم جو چراغِ سحری ہو رہا تھا اس کو حیاتِ نو ملی اور اس کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔"

مفتاح العلوم کے نائب ناظم مولانا ممتاز اپنے ایک مضمون میں ان حقائق کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں: (١٨)

"١٣٤٧ھ میں محدثِ عصر، عالمِ ربانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی دامت برکاتہم کے دور میں حدیث سے مدرسہ مفتاح العلوم کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی۔ مدرسہ کی یہ بڑی خوش بختی تھی کہ اس کی نشاۃِ ثانیہ دورۂ حدیثِ نبوی سے ہوئی۔"

مولانا حبیب الرحمٰن مسلسل ٢٢ سال تک مفتاح العلوم، مئو کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔ انھوں نے ١٣٦٩ھ (١٩٤٩ء) میں بعض اسباب کی بنا پر اس ذمہ

داری سے علاحدگی اختیار کرلی اور متعدد علما واحباب کی سعی وکوشش کے باوجود یہاں ملازم کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے۔ البتہ اس کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور سرپرست ضرور رہے۔ یہی نہیں بلکہ بوقتِ ضرورت طلبہ کو بلا معاوضہ اسباق بھی پڑھاتے رہے۔ انھیں احباب اور اہلِ شہر نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) میں مفتاح العلوم کی نظامت کا عہدہ بھی تفویض کیا تھا۔ استعفیٰ دینے کے باوجود مولانا اس ذمہ داری کو بڑی دیانت داری اور تندہی سے نبھاتے رہے۔ انھوں نے اپنے دورِ نظامت میں مفتاح العلوم کی تعمیرات میں زبردست دلچسپی لی اور متعدد کمرے تعمیر کروائے۔ ان کے پاس یہ منصب ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) تک رہا۔

والد کا انتقال:

مفتاح العلوم، مئو کی ملازمت کے زمانے میں ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) کو ان کے والد کا انتقال ہوا اور وہ گھر کی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئے۔ اپنے شاگرد مولانا محمد ظفیر الدین (مفتی دار العلوم، دیوبند) کو ایک خط میں لکھتے ہیں: (۱۹)

> ''ایک ڈیڑھ ماہ سے رشید احمد بھی بیمار ہے اور اسی کے ساتھ پدرِ بزرگوار بھی بیمار ہوئے۔ عید الاضحیٰ کے ایک دن پہلے مسجد آنے جانے لگے اور عید میں بھی گئے۔ وہ دن عافیت سے گزرا۔ رات گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ قے اور دست کے بعد جاڑا بخار بھی شروع ہوگیا۔ تین چار دن بعد نمونیا ہوگیا۔ بالآخر ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہوگیا۔ اس وقت میرا جو حال ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ والد صاحب کی نسبت لکھنا پدرم سلطان بود کا مصداق ہوگا۔ ان کے لئے ایصالِ ثواب، سعادت مندی اور تمہارے لئے موجب فیروز مندی ہوگا۔''

(مکتوب ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ)

اس زمانے میں وہ جس ذہنی انتشار میں مبتلا رہے اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو ۲۲ رمضان ۱۳۶۷ھ (جولائی ۱۹۴۸ء) کو انھوں نے مولانا ظفیر الدین کو لکھا ہے:

''میں چاہتا ہوں کہ باہر نکلوں مگر والد صاحب کی وفات اور بھائی کی علاحدگی کی وجہ سے گھر کی فکر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دو دن کے لئے بھی کہیں جانا مشکل ہو رہا ہے۔''

پہلا حج:

مولانا حبیب الرحمٰن نے پہلا سفرِ حج ستمبر ۱۹۵۰ء میں دخانی محمدی جہاز سے کیا۔ وہ غالباً ۷ استمبر کو جدہ پہنچے۔ انھوں نے اپنے سفرِ حج کی تفصیلات کئی خطوط میں بیان کی ہیں۔ یہاں ان میں سے ایک خط نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ خط مولوی رشید احمد و مولوی مختار احمد کو ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ (۲۶ ستمبر ۱۹۵۰ء) کو تحریر کیا ہے: (۲۰)

''آج یہاں ۱۴ ذی الحجہ اور ۲۶ ستمبر ہے۔ ہم لوگ ۷ ذی الحجہ کو بعد عشا بہ سواری شغدف منیٰ روانہ ہوئے اور فجر سے پہلے منیٰ پہنچ کر ہم نے فجر کی نماز مسجد خیف میں ادا کی۔ مکہ سے منیٰ کو روانگی ۸ کو چاہئے تھی مگر اونٹ کی سواری سے ۸ کو جانا سخت دشوار نیز مخل بالمقصود تھا اس لئے مذکورہ بالا صورت اختیار کی گئی۔ منیٰ سے نویں کو ۸ بجے صبح عرفات روانہ ہوئے۔ عرفات روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے پانی برسا اور بہت اولے گرے۔ ہم لوگ ایک چھپر کے نیچے چھتری اوڑھے ہوئے تھے اس وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ عشا کے قریب وہاں سے موٹر سے مزدلفہ روانہ ہوئے اور یہاں مغرب و عشا میں جمع کیا۔ بارش کی وجہ

سے سردی ہوگئی تھی اس لئے کمبل اوڑھ کر لیٹے، سحر سے بہت پہلے جاگے، پھر غلس میں نماز فجر پڑھی لیکن طلوع سے پہلے روانگی ممکن نہ ہوئی۔ مجبوراً دن نکلنے کے بعد موٹر سے منیٰ آئے اور رمی کے بعد اپنا اپنا دمِ تمتع دیا اور اپنے اپنے والد کی جانب سے قربانی کی۔ گیارہ ذی الحجہ کو موٹر سے مکہ آئے اور طوافِ زیارت سے سبکدوشی حاصل کی اور ظہر کی نماز حرم میں پڑھ کر پھر منیٰ چلے گئے۔ اس کے بعد ۱۲ ذی الحجہ کو بعد مغرب وہاں سے مکہ واپس ہوئے۔ کل یعنی ۱۳ کو کچھ زکامی شکایت ہوگئی، سر میں گرانی تھی اس لئے خط لکھنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی۔"

یوپی اسمبلی کی ممبری:

خاموشی اور دیانت داری سے علم و مذہب کی خدمت کرنا مولانا حبیب الرحمٰن کا مشن تھا اور اسی کام سے ان کو فطری مناسبت بھی تھی۔ تعجب ہے کہ کانگریس کی مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے ۱۹۵۲ء کے یوپی اسمبلی کے عام انتخاب میں انھیں مئو سے امیدوار نامزد کر دیا جبکہ انھوں نے ٹکٹ کے لیے پارلیمنٹری بورڈ سے کوئی درخواست بھی نہیں کی تھی۔ مولانا کو طوعاً و کرہاً اس پیش کش کو قبول کرنا پڑا اور وہ چھ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے منتخب بھی ہو گئے۔ اس سے ان کی عوامی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اندازہ بھی کہ حکمراں جماعت ان کا کس قدر احترام کرتی تھی یا یہ کہ وہ مولانا کی علمی طاقت و قوت سے کس قدر باخبر تھی۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو اپنے شاگرد مفتی ظفیر الدین کو جو خط لکھا ہے اس کی روشنی میں ممبری کے سلسلے کے تمام حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ دیکھئے: (۲۱)

"بحمدہٖ تعالیٰ بخیریت ہوں۔ اس دفعہ جواب میں تاخیر قصداً

ہوئی۔ دو ماہ سے میں سخت الجھن میں تھا۔ حادثہ یہ پیش آیا کہ
میرے طلب یا خواہش بلکہ وہم وگمان کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری
بورڈ نے مجھے کانگریس کی طرف سے اسمبلی کا امیدوار نامزد کر دیا
اور میری ہر طرح کی بیزاری وکنارہ کشی کے باوجود امیدوار رہنا
پڑا اور ہر چند کہ میں اس کام کے لیے نہ ایک قدم چلا۔ نہ کسی سے
ایک لفظ کہا۔ پھر بھی زبردستی کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے
دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں کھڑا رکھا گیا۔ پرسوں خدا
خدا کر کے چھ ہزار کے ووٹوں کی اکثریت سے میری کامیابی کی
خبر مجھ کو سنائی گئی۔ اس بات کی خوشی تو ضرور ہے کہ ناکامی کی
رسوائی سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔ لیکن ممبری کا سودا نہ پہلے تھا نہ
اس کامیابی کے بعد بھی کوئی انس ہے۔ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے
کہ اس کے آگے کیا ہوگا! انتظار تھا کہ نتیجہ معلوم ہو جائے تو پورا
قصہ ایک دفعہ سنا دیا جائے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن کے ایک خط مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء بنام مولانا حفظ الرحمٰن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اس جنرل الیکشن میں مئو کے ٹکٹ کے لیے مولانا عبداللطیف نعمانی صاحب کے نام کی سفارش کی تھی۔ اس خط کا سفارشی متن حسبِ ذیل ہے: (۲۲)

"غالباً جناب کو معلوم ہوگا کہ مئو کے حلقہ سے مولوی عبداللطیف
صاحب نے کانگریس کی ٹکٹ کے لیے درخواست دی ہے۔ اس
حلقہ سے اور بھی درخواستیں ہوں گی لیکن مجھ کو امید ہے کہ آپ
مولوی عبداللطیف صاحب کی درخواست پر خاص توجہ مبذول
فرمائیں گے اور اس باب میں امکانی کوشش سے گریز نہیں کریں
گے۔ درخواستیں اب مرکز میں پہنچ چکی ہوں گی اس لئے اس

موقع پر یاددہانی مناسب معلوم ہوئی۔''

اس خط سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا کو الیکشن لڑنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ مولانا عبداللطیف نعمانی کو ٹکٹ دینے کی سفارش کانگریس پارلیمنٹری بورڈ سے کررہے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ دہلی کے سیاسی قائدین نے مولانا عبداللطیف نعمانی کے بجائے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو مئو میں سیاسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ٹکٹ دینا ضروری سمجھا۔ یوں یوپی اسمبلی کی رکنیت سے وہ غیر ارادی طور سے سرفراز ہوئے۔

ندوۃ العلما لکھنؤ میں تدریسی خدمات:

یوپی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوجانے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کا پانچ سال تک لکھنؤ سے براہِ راست گہرا تعلق رہا۔ لیکن جب تک وہ ممبر رہے جب تک انھیں لکھنؤ میں رہنا پڑا اس وقت بھی سیاست پر ان کا علمی ذوق غالب رہا۔ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ذوق کی تکمیل دارالمبلغین اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے کی۔ وہ کبھی دارالمبلغین میں مقیم رہے تو کبھی ندوۃ العلما میں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان دونوں مقامات پر درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ مولانا محمد ظفیر الدین کے بیان کے مطابق موصوف نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اصرار پر ایک سال ندوہ میں بلامعاوضہ بخاری شریف کا درس بھی دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ حیرت انگیز واقعہ بھی اپنے مضمون نقوش وتاثرات میں قلم بند کیا ہے: (۲۳)

> ''اسمبلی کی ممبری ختم ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولانا کے یہاں مالی تنگی محسوس کی گئی۔ اس زمانے میں ندوہ نے طے کیا کہ سال بھر حضرت مولانا نے درس دیا ہے، یہ موقع ایسا ہے کہ حضرت مولانا کی مدد کی جائے اور سال بھر کی تنخواہ جوان

دنوں نہیں لیتے تھے بھیج دی جائے۔ چنانچہ دار العلوم ندوہ کے ذمہ داروں نے ڈرافٹ حضرت مولانا کے نام بھیجا مگر مولانا نے اسے وصول نہیں کیا بلکہ واپس فرمادیا اور لکھا کہ میں نے یہ طے کر کے پڑھانا شروع کیا تھا کہ اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کروں گا اس لیے ڈرافٹ واپس کردیا گیا ہے۔"

اس سچائی کی تصدیق مولانا حبیب الرحمٰن کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جسے انھوں نے ۲۳ فروری ۱۹۵۷ء کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام تحریر کیا ہے۔ خط کا متن یہ ہے: (۲۴)

"پرسوں ۵۰۰ روپیہ کا ایک بیمہ آیا تھا۔ میں نے اس کو واپس کر دیا ہے۔ اس سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ جب میں آؤں گا اس وقت جو حکم آپ کا ہوگا بسر وچشم منظور کرلوں گا مگر اس وقت اس کو وصول کرنے کے لئے میری طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی۔ مجھے پہلے بھی شبہ تھا اور اب اور قوی ہوگیا کہ شاید جو بات آپ نے طے کی تھی وہ کسی کو بار ہوئی اور اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا اس لیے یہ آپ نے نئی صورت تجویز فرمائی جس کا ذکر تقریراً یا تحریراً آپ نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں میرے کھانے پینے پر مدرسہ کا جو صرف ہوا اسی کا مجھ کو افسوس ہے۔ چہ جائیکہ مزید کوئی بار ڈالوں۔"

اگرچہ مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ایک سال ہی درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے اور اسمبلی کی رکنیت ختم ہونے کے بعد مئو لوٹ آئے لیکن مولانا ابوالحسن علی ندوی ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ مولانا اپنی خدمات کو ندوہ کے لئے وقف کردیں مگر مولانا ان کی اس پیش کش کو ہمیشہ ٹالتے رہے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کا مولانا ابوالحسن ندوی کا یہ خط دیکھیے۔ اس میں بھی یہی احساس وجذبہ

کارفرما ہے:

"انھیں تحقیقات وخصوصیات کی بناپر میرے دل میں جو آپ کی قدرومنزلت ہے، اس کو خدا جانتا ہے۔ کاش کہ آپ پھر اس پر غور فرماتے کہ آپ صرف دارالعلوم میں قیام کر لیتے اور صرف آپ سے رہنمائی حاصل کی جاتی اور عام استفادہ کیا جاتا۔ اب کوئی شخص نظر نہیں آتا جس سے ہم جیسے طالب علم رجوع کریں۔"

دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کی رکنیت:

دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کی رکنیت ایک قابل قدر اعزاز ہے۔ یہ اعزاز ہندوستان کے اس عالم کو بخشا جاتا ہے جو دوراندیش، صاحب بصیرت اور علم وعمل کے لحاظ سے امتیاز وتفوق کا حامل ہوتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کو یہ زبردست اعزاز ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱-۵۲ء) میں حاصل ہوا۔ وہ اس جلیل القدر منصب پر تاحیات فائز رہے۔

دوسرا حج:

مولانا حبیب الرحمٰن نے ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) میں دوسرا سفرِ حج اختیار کیا۔ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو لکھنو سے بمبئی پہنچے اور ۱۴ اگست کو شام میں ایس ایس اسلامی بحری جہاز سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جہاز ۲۴ اگست کو جدہ کے ساحل پر لنگرانداز ہوا۔ اس سفر میں انھوں نے حج وزیارت کے ساتھ ساتھ مدینہ میں مدرستہ الشرع کا کتب خانہ بھی دیکھا، جہاں کئی اہم قلمی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس سفر سے ان کی واپسی بذریعہ ہوائی جہاز ۱۰ نومبر کو ہوئی۔ ۱۵ نومبر کو بمبئی سے مئو پہنچے۔

مجلس انتظامی دارالعلوم ندوہ کی رکنیت:

انھیں مارچ ۱۹۵۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلما کی مجلسِ انتظامی نے مجلسِ انتظامی کا رکن منتخب کیا۔ اس ادارے کے ناظم مولانا ڈاکٹر عبد العلی نے انھیں اس کی اطلاع اپنے ۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء کے مکتوب میں ان الفاظ میں دی: (۲۵)

''میں دلی مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ مجلسِ انتظامی ندوۃ العلما منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۹۵۴ء میں آپ کو مجلسِ انتظامی ندوۃ العلما کا رکن منتخب کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس انتخاب کو منظور فرمائیں گے اور ازراہِ کرم اپنی منظوری سے مجھ کو مطلع کریں گے۔''

یرقان کی بیماری کا حملہ:

ان پر ۱۹۵۵ء کے آخر میں یرقان کی شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ وہ اس بیماری سے جنوری ۱۹۵۶ء میں شفایاب ہوئے۔

علمی و تحقیقی مصروفیات:

۱۹۵۸ء کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں انھوں نے خود کو علمی و تحقیقی کاموں کے لئے وقف کر دیا اور ہمیشہ اسی میں مستغرق رہے۔ ان کے استغراق و انہماک کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے اخیر لمحات تک جاری رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے حدیث کے قدیم ذخیروں کی تلاش و تحقیق کی۔ انھیں فراہم کیا۔ ان کی تصحیح کی، تعلیق لکھی اور ان کو جدید انداز سے مدون کیا۔ اس کام میں انھیں سفر کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ رات دن عرق ریزی، جانفشانی اور محنت کرنی پڑی لیکن کبھی پست ہمتی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنے قدم کو ایک منزل تمام کر لینے کے بعد دوسری منزل کی طرف خندہ پیشانی سے اٹھاتے رہے۔ یہی مولانا کی بین الاقوامی شہرت اور ان کے تحقیقی و علمی کارناموں کی مقبولیت کا دور ہے۔ اسی دور میں ان کی عالمِ اسلام میں

نمایاں شناخت ہوئی اور وہ علما کے گروہ میں علاحدہ پہچانے جانے لگے۔

مفتاح العلوم میں درسِ حدیث:

مولانا حبیب الرحمٰن کو اس دینی درس گاہ سے قلبی لگاؤ تھا اس لیے وہ اس کی خدمت کرنے کے لیے ہمیشہ راضی برضا رہتے۔ لیکن تصنیفی سرگرمیوں اور اسمبلی کی رکنیت کے باعث اس ادارے سے ان کا تعلق آٹھ سال تک منقطع رہا۔ جب وہ اسمبلی کی مدتِ رکنیت ختم ہونے کے بعد مستقل طور سے مئو میں سکونت پذیر ہوئے تو انھوں نے دوسرے ہی سال مفتاح العلوم میں کارکنانِ مدرسہ کے اصرار پر درس و تدریس کی خدمت ازسرِ نو انجام دینا شروع کی اور وہ محفل درس جو ایک مدت سے سونی تھی اس میں پھر تاب و توانائی آ گئی۔ مفتاح العلوم کی ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) کی روداد میں اس سلسلہ میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے: (۲۶)

> ''اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے ہم فخر محسوس کرتے ہیں کہ محدثِ کبیر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم نے خدامِ جامعہ کی درخواست منظور فرماتے ہوئے اس سال طلبۂ دورۂ حدیث کو درس دینا شروع فرما دیا ہے۔ و نیز طلبہ کی نگرانی اور ان کی تربیت کے پیشِ نظر حضرت مولانا اپنی خرابیِ صحت اور پیرانہ سالی کے باوجود بسا اوقات پوری مدت جامعہ میں ہی گزارتے ہیں۔ اس طرح جامعہ کے طلبہ اور دار الاقامہ کو ایک ایسے مربی کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔''

جامعات کے ممتحن:

مولانا حبیب الرحمٰن ۱۹۵۶ء میں دینی و اسلامی علوم کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن

مقرر ہوئے۔ اسی سال ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے امتحان ''ممتاز المحدثین'' کے ممتحن بنائے گئے۔ وہ بہار مدرسہ ایگزامنیشن بورڈ کے فاضلِ تفسیر اور ناگپور یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے بھی اس اثنا میں ممتحن رہے۔ انھیں جنوری ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ میں بھی علیا کی جماعتوں کے لیے ممتحن مقرر کیا گیا۔

تیسرا حج:

حضرت مولانا نے ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۱ء) میں تیسری بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ وہ ۱۳۰ اپریل ۱۹۶۱ء کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے جدہ پہنچے۔ اس سفر سے ان کی واپسی ۴ جون ۱۹۶۱ء کو ہوئی۔

چوتھا حج:

مولانا نے ۱۹۶۵ء میں چوتھا حج کیا۔ وہ اس کے لئے یکم اپریل کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے جدہ پہنچے۔ واپسی ۷ مئی کو ہوئی۔ اس سفر میں ان کی کئی اہل علم وفن سے ملاقات بھی ہوئی جن میں شیخ یحیٰی امان مکی، عبدالرحمٰن معلمی، شیخ بہجتہ البیطار شامی، شیخ مصطفیٰ زرقاء، شیخ محمد مبارک، شیخ محمد شامی، شیخ حسن مشاط مکی، مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی اور شیخ نبھانی کے اسمائے گرامی قابلِ احترام ہیں۔

احتباس بول کا مرض:

۷ جولائی ۱۹۶۹ء کو سفر کے دوران احتباس بول کی شکایت ہوئی چنانچہ جبل پور میں اتر کر فوراً آپریشن کروایا۔ دوسرا آپریشن بمبئی میں ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر اپنے ایک خط میں وہ اس طرح کرتے ہیں: (۲۷)

''۷ جولائی ۱۹۶۹ء کو مجھے بمبئی کا سفر درپیش آیا اور ریل میں

احتباس بول کی شکایت ہوئی جس نے اتنی شدت پکڑی کہ جبل پور اتر کر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں موت و زیست کی کشمکش میں ایک چھوٹے آپریشن کے بعد ربر کی نلکی کے ذریعہ پیشاب جاری کیا گیا۔ اس کے بعد اسی حالت میں بمبئی جا کر ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا اور وہاں غدود مثانہ کا آپریشن ہوا۔ چالیس دن تک وہاں رہا۔''

بیروت کا سفر (پانچواں حج):

وہ اپنی مشہور زمانہ تالیف مصنف عبدالرزاق کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں دو بار بیروت گئے۔ پہلی بار ۲۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کو بمبئی کے سانتا کروز ایئرپورٹ سے بیروت کے لئے روانہ ہوئے۔ بیروت میں ان کا قیام کم وبیش چار مہینہ رہا۔ اس قیام کے دوران رمضان المبارک (نومبر ۱۹۷۰ء) میں عمرہ کی غرض سے حجاز مقدس تشریف لے گئے جہاں بیس دن تک مقیم رہے۔ پھر جنوری ۱۹۷۱ء میں پانچویں بار حجِ بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ بیروت کے سفر سے واپسی فروری ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔

چونکہ ان کی تالیف مصنف عبدالرزاق کی طباعت کا کام مکمل نہیں ہوا تھا اور ابھی اس کی تین جلد شائع ہوئی تھی لہٰذا بقیہ جلدوں کی طباعت کی نگرانی کے لیے وہ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کو دوبارہ بیرونت پہنچے اور وہاں تقریباً دو مہینہ قیام کیا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے کچھ عرصہ کویت اور دمشق میں بھی گذارا۔ دمشق میں مکتبہ ظاہریہ، جامع اموی اور مزارِ حضرت ابوالدردا کی زیارت کی نیز شعیب ارناؤط، عبدالقادر ارناؤط، عبدالفتاح ابوغدہ، عبدالحکیم عابدین اور ناصر البانی وغیرہ سے ملاقات کی۔

مفتاح العلوم کے ناظم:

ابھی مولانا حبیب الرحمٰن تحقیقی وعلمی کاموں میں مستغرق تھے اور اپنے گھر میں حدیث کی قدیم کتابوں کی تصحیح وتعلیق میں ہمہ تن مصروف تھے کہ مفتاح العلوم کے صدر مدرس اور ناظم مولانا عبداللطیف نعمانی نے ۳ جنوری ۱۹۷۳ء کو رحلت فرمائی اور علما، احباب اور اہلِ شہر کے اصرار پر انھیں ایک مرتبہ پھر اس درس گاہ کی صدارت ونظامت کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنے شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین کو اپنے ایک خط (۲۸ فروری ۱۹۷۳ء) میں لکھتے ہیں: (۲۸)

> ''میں روزانہ مدرسہ مفتاح العلوم جاتا ہوں۔ ایک گھنٹہ بخاری پڑھاتا ہوں اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظامات کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ میں نے بلا معاوضہ یہ بوجھ اٹھالیا۔ صرف اس لیے کہ طلبہ کا نقصان نہ ہو اور مدرسہ کے ہمدرد لوگ بددل اور مایوس نہ ہوں۔ لیکن ہر وقت یہ فکر دامن گیر ہے کہ ہر ضروری شعبوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایک ایک موزوں آدمی مل جائے یا تیار ہو جائے۔''

اس خط سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے تحقیقی وعلمی کاموں کے علاوہ اس بوجھ اور ذمہ داری کو بر بنائے خلوص اٹھایا تھا اور پوری دیانت داری سے مدرسہ کے انتظامات بھی کر رہے تھے لیکن بُرا ہو مفاد پرستی اور اقتدار پرستی کا کہ چند سیاسی لوگوں نے مفاد واقتدار کی ہوس میں مولانا کے مخلصانہ کاموں میں روڑے اٹکانے شروع کیے جس سے مجبور ہو کر انھوں نے ۱۹۷۵ء میں اس ذمہ داری اور منصب سے علاحدگی اختیار کرلی۔ ان حالات وواقعات پر مولانا نے اس طرح روشنی ڈالی ہے: (۲۹)

> ''مولوی عبداللطیف صاحب نعمانی کے انتقال کے بعد پھر مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا اگر یہ سلسلہ صرف اس وجہ

سے دیر پا نہ ہو سکا کہ مجلسِ انتظامی کا جدید انتخاب کئی سال سے نہیں ہوا تھا۔ نعمانی صاحب کے وقت میں بھی بار بار یہ تجویز پاس ہوئی کہ نیا انتخاب ضروری ہے اور میرے آنے کے بعد بھی۔ مگر ممبران ہمیشہ رکاوٹ ڈالتے رہے۔ اس لیے میں نے مدرسہ جانا بند کر دیا اور لکھ کر بھیج دیا کہ جب تک نیا انتخاب نہ ہوگا میں مدرسہ نہیں آسکتا۔ انجام کار نیا انتخاب نہیں ہوا اور نعمانی کے لڑکوں نے ایک غیر قانونی مجلس میں نعمانی کے بڑے لڑکے کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا۔ حالانکہ یہ انتخاب اور انتخابی مجلس بالکل ناجائز اور غیر قانونی تھی۔ مدرسہ کے دستور دفعہ ۷ کی رو سے کوئی مجلس بغیر ناظم کے منعقد نہیں ہو سکتی اور یہ مجلس جس میں انتخاب ہوا اس کو نہ میں نے بلایا تھا اور نہ میں نے اس کا حکم دیا تھا اور نہ میں اس میں موجود تھا۔"

حیاتِ ابوالمآثر کے مصنف ڈاکٹر مسعود احمد کے بیان کے مطابق اس وقت مجلسِ انتظامی میں دراصل جس قسم کے لوگ غالب تھے ان سے مدرسہ کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا اور اس کے مقاصد و دینی مصالح کو ذاتی مفادات اور سیاسی مصلحتوں کے مقابلے میں پس پشت ڈالا جا رہا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر علامہ اعظمی مجلس انتظامیہ کو یکسر تبدیل کرنے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن اراکین اس تبدیلی کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس نظریاتی اختلاف کے باعث حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہوگئی کہ وہ پروسیڈنگ بک جس پر ابتدا سے مولانا عبداللطیف کے انتقال کے پہلے تک کی کارروائیاں درج تھیں، مخالفین نے غائب کر دیں اور قبض الوصل کا رجسٹر بھی گم کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دستور العمل کو مسلسل پامال اور اصول وضوابط کو رسوا کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر مسعود احمد لکھتے ہیں: (۳۰)

''علامہ اعظمی کے خلاف جو محاذ آرائی کی گئی اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ مدرسہ کا اتر پردیش عربی و فارسی بورڈ سے جو الحاق تھا اس کو آپ ختم کرانا چاہتے تھے۔ آپ کو مدرسہ پر سرکاری اثر و نفوذ دیکھنا کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ گویا ان کی خداداد بصیرت اس سے مرتب ہونے والے اثرات اور آگے آنے والے خطرات کو دیکھ رہی تھی۔ اس لیے ان کی قطعی رائے یہ تھی کہ مدرسہ آزادانہ طور پر علمِ دین کی خدمت انجام دے۔ سرکار یا سرکاری امداد کا دست نگر اور محکوم نہ ہو۔ سرکاری امداد کی بنیاد پر دینی مدرسہ چلانا ان کے نزدیک مدرسہ کو سرکاری تحویل میں دے دینے کے مترادف تھا۔ لیکن مخالفین کے لیے ان کا یہ نظریہ بھی قابلِ قبول نہ تھا۔

موقع پرستوں نے علامہ اعظمی کی مفتاح العلوم سے توجہ ہٹانے اور اس پر اپنی گرفت جمانے کے لیے ایسے ایسے ہتھکنڈے آزمائے جن سے ادارے کی پوری تاریخ شرمسار ہے۔ ان کرم گستروں نے علامہ اعظمی اور ان کے متعلقین کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچیں .... نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے دیا۔ مگر واہ رے استقامت کہ نصف صدی تک جس باغ کی اپنی خونِ جگر سے آبیاری کی اس سے جدائی تو برداشت کر لی مگر اپنے نقطۂ نظر سے سمجھوتہ کرنا ہرگز گوارا نہ کیا۔''

مخالفین نے ان کے خلاف جو ماحول بنایا تھا اس سے ان کا کرب و اضطراب اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا غم غلط کرنے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے اپنے

وطن سے باہر قصبہ بہادر گنج یا کہیں اور چلے جایا کرتے اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر علمی کام کیا کرتے۔

شیخ الازہر کی آمد:

دارالعلوم ندوۃ العلما کا پچاس سالہ اجلاس ۳۱ اکتوبر اور ۱-۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو شان و شوکت سے منعقد ہوا جس میں عالمِ اسلام کی متعدد ممتاز شخصیتوں نے شرکت فرمائی۔ ان میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کا نام سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف کا ہندوستان میں ہفتہ عشرہ سے زائد قیام رہا۔ اس دوران مولانا حبیب الرحمٰن انھی کے ہمراہ رہے۔ ندوہ کے اجلاس کے اختتام کے بعد شیخ الازہر نے بمبئی اور ڈابھیل کا سفر کیا۔ اس سفر میں بھی علامہ ان کے ساتھ تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جامع اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الازہر کو اعزاز و دستار فضیلت دینے کے لیے جس جلسہ کا انعقاد کیا گیا اس میں مولانا حبیب الرحمٰن ہی نے شیخ الازہر کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور جلسہ کی صدارت فرمائی۔

دل کا دورہ اور طویل علالت:

مولانا حبیب الرحمٰن پر ۲۰ مئی ۱۹۷۶ء کو نہایت زبردست جان لیوا قسم کا دل کا دورہ پڑا جس کے باعث وہ مہینوں بستر علالت پر رہے۔ اس سلسلے میں وہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کو ۲۱ جون ۱۹۷۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: (۳۱)

> ''میں خود کو اس بات پر برابر ملامت کر رہا ہوں کہ ڈابھیل میں آنجناب سے جدا ہونے کے بعد آپ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کر سکا اور یہ زوائد مسند بزار وغیرہ کے بعض حصوں کی تحقیق کو جو ناقص چھوڑ دیا تھا، ان کی تکمیل، کچھ مسودات پر نظرِ ثانی اور مختلف

بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے تھا۔ یہاں تک کہ بیماری کا آخری حملہ ۲۰ مئی کو ہوا جبکہ میرے اوپر دل کا نہایت خطرناک دورہ پڑا۔ لیکن اللہ پاک نے لطف وکرم کا معاملہ فرمایا اور جلد شفا عطا فرمائی۔ لہٰذا ایک ماہ بعد اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکوں......" (عربی سے ترجمہ)

سفر شام (ساتواں حج):

شام کے اربابِ علم وفضل اور عقیدت مندوں کی دعوت پر مولانا حبیب الرحمٰن نے ۱۹۷۸ء میں شام کا سفر کیا۔ اس سفر کے لیے وہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۸ء کو سیرین ایرلائن کے جہاز سے دہلی سے دمشق پہنچے۔ دمشق میں ۲ دن قیام کے بعد حلب روانہ ہوئے۔ یہاں تقریباً سوا مہینہ قیام رہا۔ وہ ۶ نومبر ۱۹۷۸ء کو دمشق سے بذریعہ سعودی ایرلائنس جدہ پہنچے اور ساتویں بار فریضۂ حج ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ رابطۂ عالمِ اسلامی کی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ وہ ۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جدہ سے بمبئی واپس آئے۔

اس سفر میں شام کے کئی اہلِ علم وفضل نے ان سے کسبِ فیض کیا اور سند واجازت حاصل کی۔ انھوں نے شام کے مختلف شہروں اور تاریخی مقامات کو دیکھا۔ خصوصاً حلب کے علما سے زیادہ ملاقاتیں رہیں اور اس مشہور مرکزِ علم وفضل کی جی بھر کی سیاحت بھی کی۔

المعہد العالی کی بنیاد:

مفتاح العلوم سے علاحدہ ہونے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن نے طلبہ میں علمِ دین کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے ایک مخلصانہ منصوبہ بنایا اور اس کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اپنے محلے میں زمین خرید کر ایک عالی شان مسجد تعمیر کروائی اور اسی مسجد کے

اطراف کی زمین پر چند کمرے تعمیر کروا کے ۱۹۸۰ء کے آس پاس المعہد العالی کی بنیاد ڈالی۔ اس میں انھوں نے فارغین علما کی اعلا پیمانے پر تربیت کا اہتمام وانتظام کیا۔ اس کے لیے شعبۂ تخصص فی الحدیث، شعبۂ علم القرآن اور شعبۂ علم فقہ قائم کیا اور خود طلبہ کو ان شعبوں سے متعلقہ کتابوں کا درس بھی دیا۔ وہ اس میں طلبہ کو تین چار سال داخلہ دیتے رہے مگر طلبہ ان کے معیار پر پورے نہ اتر سکے لہٰذا ۱۹۸۴ء میں اسے بند کر دیا۔ اس ادارے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود احمد لکھتے ہیں: (۳۲)

"المعہد العالی کا قیام نہایت بلند اور عظیم مقصد کے لئے ہوا تھا۔ اس سے آپ کا ارادہ یہ تھا کہ مدارس دینیہ کے فارغ التحصیل طالب علموں کو اعلا تعلیم وتربیت کے ذریعہ درس وتدریس، بحث وتحقیق، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ جیسے مختلف شعبوں کے لیے تیار کریں اور ان کی ٹریننگ اس نہج سے کریں کہ عصرِ حاضر کے چیلنجوں اور نت نئے مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام اور علومِ دینیہ کی صحیح طور پر خدمت بجالائیں۔ اس کے لئے علامہ اعظمی نے خود ہی نصاب ترتیب دیا۔ جو کتابیں دستیاب نہیں تھیں اسلامی اور عرب ممالک سے وہ کتابیں منگوائیں اور تنِ تنہا اس کام کا آغاز کر دیا۔"

مرقاۃ العلوم:

مولانا حبیب الرحمٰن نے المعہد العالی کے ساتھ ساتھ مسجد کے اطراف کے کمروں میں ایک مدرسہ مرقاۃ العلوم کے نام سے بھی جاری کیا۔ یہ مدرسہ آج بھی جاری ہے اور بڑی وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کو ترقی دینے اور فروغ کی منزل سے ہمکنار کرنے میں حضرت مولانا کی بے لوث خدمات ناقابلِ فراموش

ہیں۔اس مدرسہ کی خوبی یہ ہے کہ مئو کے تقریباً تمام قدیم مدارس الہ آباد بورڈ سے ملحق ہوگئے ہیں اوران کے مدرسین کی تنخواہیں بھی حکومت اتر پردیش سے ملنے لگی ہیں۔ لیکن مرقاۃ العلوم وہ واحد مدرسہ ہے جو حکومت کی امداد کو قبول نہیں کرتا بلکہ عام مسلمانوں کے عطیات اورصدقاتِ واجبات سے اس کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔

صدر جمہوریہ ایوارڈ:

انھیں ۱۹۸۴ء میں ان کی شاندار علمی ودینی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

مصر کا سفر:

مولانا حبیب الرحمٰن مصر کے سفروزیارت کے ہمیشہ خواہش مندرہے۔ان کی یہ خواہش نومبر ۱۹۸۵ء میں پوری ہوئی۔وہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے مصر پہنچے اوروہاں ۱۳دن مقیم رہے۔اس سفر میں مصری اہلِ علم اور کانفرنس کے شرکانے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔وہ ۱۶ نومبر کو اس سفر سے ہندوستان واپس آئے۔

امیر الہند کا خطاب:

جمعیت العلمائے ہند نے ۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو دفتر جمعیت العلما ہند، نئی دہلی میں علماوفضلا اوردانشوروں ومفکروں کا ایک نمائندہ اجلاس کیا۔اس اجلاس میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی پر غوروخوص کیا گیا۔اسی اجلاس میں مولانا حبیب الرحمٰن کو اتفاق رائے سے امیر الہند منتخب کیا گیا۔

وفات:

مولانا حبیب الرحمٰن پیرانہ سالی کے باوجود درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے۔ بالکل اخیر عمر میں جبکہ انھیں ضعف و نقاہت نے پوری طرح گھیر لیا تھا وہ علمی کاموں میں ڈوبے رہے۔

عمر کے آخری حصہ میں بیماری کے حملے ہوتے رہے۔ ان کی داہنی آنکھ کا آپریشن بھی ہوا جو بدقسمتی سے کامیاب نہ ہوسکا اس سے بینائی متاثر ہوکر رہ گئی۔ اب ان کی غذا بہت کم ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود علم کے ذوق کا وہی عالم تھا۔ وہ اپنے بیٹے مولوی رشید احمد کی مدد سے اپنے علمی ذوق کی تکمیل کرتے رہے۔ جب نقاہت کا بہت غلبہ ہوا تو چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے۔ اس وقت ان کے بعض مخلص اور جاں نثار خدام انھیں سہارا دے کے اٹھاتے بٹھاتے رہے۔ کرسی پر بٹھا کر مدرسہ اور مسجد تک پہنچاتے۔ جب بھی ان کی صحت تشویشناک صورت اختیار کرتی تو ہر طرف مایوسی چھا جاتی۔ ان کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر ان کی ہمیشہ نگرانی کیا کرتے۔ انھی کے مشورہ سے ہمیشہ علاج چلتا رہا۔ اخیر میں صورت حال مسلسل تشویشناک رہنے لگی تھی۔ آخر کے کئی مہینے ایسے گزرے کہ ڈاکٹر نے ملاقات پر پابندی عائد کردی اور انھیں بات کرنے سے سختی سے منع کردیا۔ اس حالت میں ملک کے کئی اکابر علما اور مشاہیر ان کی عیادت کو آئے اور واپس چلے گئے۔ اس لیے کہ انھیں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب ان پر عام طور سے غفلت یا نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ آخری مہینہ بالکل ناامیدی اور مایوسی میں گزرا۔ وصال کے دن مکمل بے ہوش رہے اور اسی حالت میں ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو بوقتِ مغرب اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

آخری سفر:

مولانا حبیب الرحمٰن کے انتقال کی خبر بڑی تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی چنانچہ

جب دوسرے دن ان کا جنازہ اٹھا تو منو کی تمام گلیاں، سڑکیں اور شاہراہیں ان کے عقیدت مندوں سے بھر گئیں۔ مولانا کی رہائش گاہ کے اطراف اتنا زبردست مجمع تھا جیسے کسی بہت بڑے دریا میں یک بہ یک طوفانی سیلاب آگیا ہو۔ ہر طرف انسان ہی انسان نظر آرہے تھے۔ اس قدر ہجوم تھا کہ اچھے اچھے ماہرین تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ تقریباً دن میں بارہ بجے انھیں غسل دیا گیا اور ایک بجے جنازہ باہر لایا گیا۔ جنازے کو کاندھا دینے والوں کی سہولت کے لئے جنازے کے چاروں پایوں میں بلیاں باندھی گئیں۔ عقیدت مندوں کا یہ عالم تھا کہ کاندھا دینے کے لیے ایک دوسرے پر اس طرح ٹوٹ رہے تھے کہ انھیں اپنی جان کی بھی پرواہ نہ تھی۔ جو جنازے کو کاندھا نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے رومال یا انگوچھے سے ہی ایک بار جنازہ کو مس کر دینا باعثِ سعادت سمجھ رہے تھے۔ جنازہ شانہ بشانہ آگے بڑھتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ریلوے گراؤنڈ پہنچا۔ جو مئو کا سب سے وسیع وعریض میدان ہے۔ شدت کی گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں مولانا کے شاگردِ رشید مولانا عبدالجبار نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد انھیں تقریباً ۲ لاکھ عقیدت مندوں کی موجودگی میں مدرسہ مرقاۃ العلوم کے میدان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے ایڈیٹر مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ وہ اس منظر کا نقشہ معارف (اپریل ۱۹۹۲ء، ص: ۲۱۲-۲۱۱) میں اس طرح کھینچتے ہیں:

> "اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے جنازے سے ہوا جس میں شرکت کے لئے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا۔ مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیام گاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے لیکن دید و زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔

ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازے کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہلِ تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی کی معیت میں ریلوے میدان گئے۔ جہاں اتنے لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے ہوئے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ ہونے کے توقع، تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے جن کی زبان وقلم ہمیشہ احادیث کی شرح وترجمانی اور ان کی مشکلات وغوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی کی خدمت وفروغ اور نادر ونایاب کتبِ احادیث کی طبع و اشاعت کے لئے وقف رہا ہے۔''

مولانا نظام اسیر ادروی نے بھی اس منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں: (۳۳)

''جنازہ کی نماز اور جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کی کثرت اگر عند اللہ مقبولیت کی علامت ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ خداوند قدوس کے مقبول اور مقدس ترین بندوں میں سے تھے۔ آپ خود غور کریں کہ مولانا موصوف عرصۂ دراز سے گوشۂ خلوت میں رہتے تھے، عوام سے بقدرِ ضرورت ہی رابطہ تھا۔ ایک گمنام اور غیر مشہور گلی میں آپ کی سکونت تھی۔ اس راستے سے گذرنے والا کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس گلی کے ایک خام سفالہ پوش مکان میں ایک ایسی عظیم الشان شخصیت ہے کہ بقول حفیظ بنارسی:

دشتِ عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی

لوگوں پر آپ کی عظمت، علوئے شان اور عنداللہ مقبولیت کا راز اس وقت کھلا جب ان کا جنازہ دیکھا۔ شہر کے سارے مسلم و غیر مسلم حیرت واستعجاب کی نگاہوں سے انسانوں کے اس سیلاب عظیم کو دیکھ رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو خبر بھی نہیں تھی کہ اس شہر میں کوئی اتنی عظیم شخصیت بھی رہتی ہے۔ ابتدائے شب میں جب آپ سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں اس وقت گنتی کے چند افراد موقعہ پر موجود ہیں۔ لیکن صبح ہوتے ہی سفید پوش انسانوں سے مئو کی گلیاں، سڑکیں، شاہراہیں بھر گئیں۔ مولانا کی رہائش گاہ کے چاروں طرف مسلمانوں کا جم غفیر اس طرح چھا گیا جیسے کسی بہت بڑے دریا میں یک بیک طوفانی سیلاب آ گیا ہو۔

نماز جنازہ میں تخمیناً دولاکھ مسلمان شریک ہوئے۔ میرے محدود علم ومطالعہ کے مطابق اس پوری صدی میں ہندوستان میں کسی عالمِ دین کا اتنا بڑا جنازہ نہیں اٹھا، جس کی نمازِ جنازہ اتنے مقدس ترین اور اتنے بڑے مجمع نے ادا کی ہو۔ مولانا موصوف کے سوا دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ دولاکھ مسلمانوں کا خالص یہ مجمع اور پھر اس مجمع کا ہر ہر فرد روزے سے۔ گرمیوں کا موسم ہے، ٹھیک دوپہر میں جنازہ اٹھتا ہے، ایک میل پا پیادہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں لوگ مشایعت کرتے ہیں اور جب ریلوے گراؤنڈ میں پہنچتے ہیں جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی ہے، پورے لق ودق میدان میں ایک درخت کا سایہ بھی نہیں۔ موسم گرما کا تمتمایا ہوا سورج سروں پر چمک رہا ہے۔ اس کی کرنیں روزہ داروں کے

بھوکے پیاسے جسم پر تیر کی طرح برس رہی ہیں۔ اب دن کے
دو بج جاتے ہیں۔ دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر آجاتی ہے،
دو لاکھ روزہ رکھے ہوئے مسلمانوں کا مقدس و منتخب روزگار مجمع
حضرت مولانا اعظمی کی نمازِ جنازہ پڑھتا ہے۔ دعائے مغفرت
کرتا ہے۔ درجات کی بلندی کی دعائیں مانگتا ہے۔ کیا
ہندوستان میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ
شرف، یہ افتخار صرف محدثِ جلیل، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب
الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔"

شعرا کا خراج عقیدت:

مولانا کی موت سے متاثر ہوکر اردو کے کئی شاعروں نے انھیں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن میں پروفیسر حفیظ بنارسی، مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی، امیر الاعظمی، قاضی کوثر اعظمی، مولانا عطاالرحمٰن عطا بھاگلپوری، گمان انصاری، صابر حبیب الاعظمی اور محمد عثمان معروفی کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں حفیظ بنارسی کی نظم نثر محمد عثمان معروفی اور مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی کا قطعۂ تاریخ قلمبند کیا جاتا ہے:

محدثِ جلیل

علمِ حدیث پاک کا دیوانہ چل بسا
جس کا ہر اک سخن تھا حکیمانہ چل بسا
محفل میں اب وہ گرمیِ محفل نہیں رہی
نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا
دشتِ عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی
وہ اعتبارِ گلشن و ویرانہ چل بسا
عرفان و آگہی کا پیامی نہیں رہا
رقصاں تھا جس سے علم کا پیمانہ چل بسا
جس کی ہر اک نظر میں بھری تھی مئے طہور
واحسرتا وہ پیر قدح خانہ چل بسا

شاہنشہِ علوم، فقیہِ گہر فشاں دنیا کی انجمن سے فقیرانہ چل بسا

ساغراداس اداس ہیں، پیمانے سرنگوں وجہِ فروغِ محفلِ رندانہ چل بسا

تھا افتخارِ عالمِ اسلام جو حفیظ

سوئے جناں وہ دین کا دیوانہ چل بسا

قطعۂ تاریخِ وفات

بزمِ آثار وسنن کے آہ وہ صدر الصدور حضرتِ اقدس، محدث صاحبِ طبعِ غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر بوالمآثر وہ امامِ ناقدانِ ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم و بےنوا ہے ابھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے، بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہرِ علم حدیثِ مصطفیٰ رخصت ہوئے تشنگانِ علم جائیں یا خدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم ساقیا تیری شرابِ کہنہ کا کیف وسرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شانِ علم میں لوگ دوڑاتے رہیں اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاریِ زمن تھے وقت کے ابنِ حجر فنِ اسماء پر انھیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد زندگی سے بھی فزوں تھا ان کی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج من اہل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی جنت الفردوس میں ان کو ملیں حور وقصور

عمر اقدس ہے محامد اسعدِ محزن لکھو

۹۳

ابتدا اخترِ حسن ہے، خاتمہ وصلِ غفور

۱۳۱۹ھ ۱۴۱۲ھ

صنعتِ مربع با امیر الہند امامِ دیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

۲ ۹ ۹ ۱ عیسوی

	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	
۱۹۹۲	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	۱۹۹۲
۱۹۹۲	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	۱۹۹۲
۱۹۹۲	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	۱۹۹۲
	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	

بقلم راست محمد عثمان معروفی

۲ ۹ ۹ ۱ء

یہ مصرعہ چاروں طرف سے پڑھا جا سکتا ہے اور ہر طرف سے سالِ رحلت ۱۹۹۲ء برآمد کیا جا سکتا ہے۔

تعزیت نامے:

مولانا کے انتقال کی خبر سن کر عالمِ اسلام کی مقتدر ہستیوں پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تعزیت ناموں سے لگایا جا سکتا ہے:

''حضرت مولانا کی وفات عالمِ اسلام کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت

ہے۔......الشرق والاوسط میں جب انتقال کی خبر پڑھی تو مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چند ماہ ہوئے کہ میں نے مولانا مرحوم کو ایک خط لکھا تھا جس میں میں نے اپنے دوست محمد رشید اور اپنے بیٹے سلمان کے لیے روایت حدیث کی اجازت طلب کی تھی......'' (الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ریاض)

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی وفات کی خبر ملی۔ آپ تنہا اس مصیبت میں گرفتار نہیں ہیں بلکہ یہ تمام امتِ مسلمہ کے لیے ایک بڑی مصیبت ہے۔ مولانا کی حیات میں علمی حلقوں میں کوئی خلا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آپ کے انتقال کے بعد اب ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ اس کا پُر ہونا موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔'' (الشیخ محمد عوامہ، مدینہ منورہ)

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خبرِ وفات سے انتہائی صدمہ پہنچا۔ آپ کی وفات سے امتِ اسلامیہ ایک عظیم المرتبت عالم اور ایک ایسے امامِ وقت سے محروم ہوگئی جس نے عظیم الشان علمی خدمات انجام دیں اور حدیثِ رسولؐ کی حفاظت کے لیے اہم ترین کارنامے انجام دیے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں بلند مقام دے۔'' (ڈاکٹر محمد طاہر نوروتی۔ مکہ مکرمہ)

''حضرت مولانا کے حادثۂ وفات کی خبر ملی۔ یہ صدمہ میرے لیے ناقابل برداشت بن گیا۔ یہ عظیم حادثہ آپ پر تنہا نہیں گزرا ہے بلکہ عالمِ اسلام اس صدمے سے دوچار ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے قلم اور زبان کو حدیثِ نبوی کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ بلاخوف لومتہ لائم اپنے عہدِ

شباب سے سفرِ آخرت کے وقت تک اس کام میں لگے رہے۔ مولانا
ہمارے لیے بہت بڑا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو حدیثِ نبوی، عملِ اسلامی اور
فکرِ اسلامی کے میدان میں ہے۔ آپ کی وفات سارے عالمِ اسلام کے
لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔'' (مولانا اقبال احمد ندوی۔ نائجیریا)

''حضرت مولانا کی وفات کا غم پوری امت کا غم ہے۔ ایسی باکمال ہستیاں
تاریخ میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ مولانا مرحوم کے علمی کارناموں کی بہت
بڑی اہمیت ہے۔'' (مولانا بدر الحسن القاسمی الصفات۔ کویت)

''حضرت مولانا مرحوم کے حادثۂ وفات کی خبر ملی...... اس میں کوئی شک نہیں
کہ اس خلا کو پُر کرنے والا اس وقت کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اب ہماری
رہبری اور نصرت فرمائے اور مولانا مرحوم کی عظیم خدمات کو علمائے اسلام اور
امتِ مرحومہ کے لیے زیادہ فائدہ مند بنائے۔'' (المعہد الاسلامی، واٹروال،
جوہانسبرگ، ساؤتھ افریقہ)

''آج ہم نے عالمِ اسلام کے سب سے بڑے محدث کو کھو دیا اور ہماری
صفوں میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اب اس خلا کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔''
(مولانا مرغوب الرحمٰن مہتمم دار العلوم دیوبند)

''حضرت مولانا اعظمی کی وفات سے علومِ دینیہ بالخصوص فنِ حدیث کے
سلسلے میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور خلا پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت
سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے جس کی برِ صغیر ہند و پاک ہی نہیں

ممالکِ عربیہ اور مراکزِ اسلام پر بھی نظر ہے اور وہاں کے علما، اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت لوگوں کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے......''
(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔لکھنؤ)

''محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے حادثۂ وفات کی خبر حقیقتاً علمی حلقوں کے لیے صاعقہ اثر ثابت ہوئی۔اس حادثے سے ہندوستان کا وہ امتیاز بظاہر اب ختم ہوگیا جس کا اعتراف علامہ رشید رضا مصری نے برملا کیا تھا کہ اس آخری دور میں علمِ حدیث کی خدمت کا سہرا ہندوستان کے سر بندھا اس لیے یہ خسارہ صرف ایک خاندان یا ایک ملک کا نہیں بلکہ پورے برِ صغیر کا خسارہ ہے۔'' (مولانا برہان الدین سنبھلی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال محض ایک کنبہ وخاندان کے لیے نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کے لیے ہے۔آپ کی ذاتِ گرامی عالمِ اسلام میں مغتنمات روزگار اور بے مثال تھی۔ممتاز ترین علما میں بھی اور انگلیوں پر گنے چنے چند افراد کے اندر بھی ممتاز ونمایاں تھی۔'' (مفتی نظام الدین، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

''حضرت مولانا بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے اور فن حدیث میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ان کی وفات سے علوم حدیث کے حاملین اور مسلمان علما اور رہبرانِ ملت کی صف میں غیر معمولی نقصان ہوا ہے جس کی تلافی جلد مشکل ہے۔حضرت مولانا کی شفقتوں سے میں ذاتی طور پر متمتع ہوا ہوں اور عقیدت ومحبت کا بہت قریبی تعلق رکھتا ہوں اور ان کو اپنا استاد سمجھتا

رہا ہوں اور ان کے وجود کو ملتِ اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں۔"
(مولانا محمد رابع حسنی ندوی۔ندوۃ العلما لکھنؤ)

اہل وعیال:

مولانا نے اپنی زندگی میں دوشادیاں کیں۔ پہلی شادی ایامِ طالب علمی میں مقیمہ خاتون کے ہمراہ ہوئی جو ان کے استاد مولوی عبدالرحمٰن کی صاحبزادی تھیں۔ لیکن ابھی رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس نیک بخت خاتون کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالرحمٰن کے بھائی مولوی عبدالعزیز کی بیٹی آمنہ خاتون کے ہمراہ ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کا عقد ہوا۔ مولوی عبدالعزیز بھی ان کے استاد تھے اور مفتاح العلوم کے نائب صدر مدرس رہ چکے تھے۔ آمنہ خاتون نے خاصی طویل عمر پائی۔ ان کا ۹ جون ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا۔ ان سے تین بیٹے اور سات بیٹیاں ہوئیں جن کے نام یہ ہیں۔ عائشہ، اسماء، رضیہ، ذکیہ، رشید احمد، صفیہ، خدیجہ، سعید احمد، عبیدہ اور مختار احسن۔ ان میں چھوٹے بیٹے مختار احسن اور تین بیٹیوں کا مولانا کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا۔ مولانا کی وفات کے وقت دو بیٹے اور چار بیٹیاں بقیدِ حیات تھیں۔

تلامذہ:

مولانا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ درس وتدریس میں گزرا لہٰذا ان سے علمی استفادہ حاصل کرنے والوں کا شمار ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ ان کے بعض تلامذہ نے علمی دنیا میں وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک ان کا نام ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالجبار مئوی (شیخ الحدیث مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئو)، مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ)، مولانا محمد حسین بہاری (مدرس دارالعلوم، دیوبند)، مولانا عبدالرشید حسینی مئوی (مدرس مفتاح العلوم، مئو)، مولانا محمد یحییٰ اعظمی

(مدرس مفتاح العلوم، مئو)، مولانا عبدالستار معروفی (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ)، مولانا محفوظ الرحمٰن نامی (بانی نورالعلوم، بہرائچ)، مولانا قاری ریاست علی بحری آبادی، مئوی (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم، مئو)، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی (مفتی دارالعلوم، دیوبند)، مولانا ضیاء الحسن اعظمی (شیخ الحدیث و صدرالمدرسین مظہر العلوم، بنارس اور شیخ الحدیث ندوۃ العلما، لکھنؤ) اور مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی (مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلما، لکھنؤ) ان کے وہ مایۂ ناز تلامذہ ہیں جنھوں نے دینی وعلمی اعتبار سے ایسی زبردست خدمات انجام دی ہیں جنھیں ملت اسلامیہ کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

شخصیت:

مولانا کی شخصیت بڑی بارعب اور پُر جلال تھی۔ جسمانی لحاظ سے بہت تندرست اور توانا تھے۔لباس بہت ہی معمولی قسم کا پہنتے اور خوراک بھی بہت ہی سادہ نوش فرماتے۔ان کی آنکھوں میں زہد وتقویٰ کا نور اور چہرہ پر شرافت ومتانت کی روشنی تھی۔استغنا وبے نیازی کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے حکمراں کے دعوت نامے کو بھی سرد خانوں میں ڈال دیتے تھے۔ان کی طبیعت میں بلا کی غیرت وخودداری تھی۔ان کی ذات میں دینی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔خدا نے انھیں ذہانت وفطانت کی بے حساب نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ان میں استدلال کی زبردست قوت تھی۔یہی وجہ تھی کہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو قرآن وسنت اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں آسانی سے حل کرلیا کرلیتے تھے۔انھیں کتابوں کے مطالعہ کا بے انتہا شوق تھا۔اپنا زیادہ وقت اسی میں صرف کرتے۔نادر ونایاب کتابوں اور مخطوطات کی حصولیابی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔اگر وہ ان کی دسترس سے باہر ہوتے تو کوشش کرکے ان کی نقلیں منگواتے۔وہ اپنے اوقات کو فضول کاموں میں کبھی ضائع نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ علمی سرگرمیوں میں

مصروف رہا کرتے۔ انھیں نثر نگاری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خدا نے انھیں زبردست تحقیقی و تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

حواشی:

۱۔ حیات ابوالمآثر، از ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی، ناشر المجمع العلمی، مئو (۲۰۰۰ء) ص:۳۵۔

۲۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۰

۳۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، مطبوعہ جامعہ اسلامیہ، بنارس، (۱۹۷۶ء)، ص:۳۳۸

حیات ابوالمآثر، ص:۷۶، ۷۷

۴۔ حیات ابوالمآثر، ص:۸۷

تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، ص:۳۳۹

۵۔ حیات ابوالمآثر، ص:۷۹

۶۔ حیات ابوالمآثر، ص:۸۱

۷۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند (جلد دوم)، مرتبہ سید محبوب رضوی، مطبوعہ جید پریس، دہلی (۱۹۷۸ء)، ص:۱۲۴

۸۔ حیات ابوالمآثر، ص:۸۴

۹۔ حیات ابوالمآثر، ص:۹۳

۱۰۔ حیات ابوالمآثر، ص:۱۰۱

۱۱۔ حیات ابوالمآثر، ص:۱۰۹

مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء)، ص:۱۴۱، ۱۴۲

۱۲۔ حیات ابوالمآثر، ص:۱۱۰

۱۳۔ تاریخ دارالعلوم، دیو بند (جلد دوم)، ص:۱۴۲

۱۴۔ مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (جولائی تا دسمبر۱۹۹۲ء)، ص:۱۴۲

۱۵۔ حیات ابوالمآثر، ص:۱۵۳

۱۶۔ حیات ابوالمآثر، ص:۱۶۵

۱۷۔ مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (جولائی تا دسمبر۱۹۹۲ء)، ص:۱۴۴

۱۸۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۰۵

۱۹۔ مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (جولائی تا دسمبر۱۹۹۲ء)، ص:۱۴۶

۲۰۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۱۴

۲۱۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۲۱،۲۲۲

۲۲۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۲۰

۲۳۔ مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (جولائی تا دسمبر۱۹۹۲ء)، ص:۱۵۱

۲۴۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۷۲

۲۵۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۶۸

۲۶۔ حیات ابوالمآثر، ص:۲۸۲

۲۷۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۱۵

۲۸۔ مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس (جولائی تا دسمبر۱۹۹۲ء)، ص:۱۵۱

۲۹۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۵۴

۳۰۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۵۶

۳۱۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۶۶

۳۲۔ حیات ابوالمآثر، ص:۳۸۰

۳۳۔ حیات ابوالمآثر، ص:۴۳۱،۴۳۲

علمی خدمات

مولانا حبیب الرحمٰن نے ۱۹۲۰ء کے آس پاس اپنا قلم سنبھالا اور مذہبی و علمی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کیے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں جو تصنیفی کارنامے انجام دیے ہیں وہ مختصر رسائل کی صورت میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیان دارالعلوم، مئو (اعظم گڑھ) کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد جب فکر و شعور میں مزید پختگی آئی تو اختلافی موضوعات پر کئی بلند پایہ تصانیف اردو میں قلمبند کیں جو ردِ فتنۂ انکارِ حدیث، ردِ غیر مقلدین، ردِ شیعیت اور ردِ رضا خانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں متعدد معرکۃ الآرا مقالات بھی وقفے وقفے سے تحریر کیے جو ملک کے گراں قدر علمی و تحقیقی جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن ان کے یہ تمام کارنامے ایک خاص طبقے اور حلقے تک ہی محدود رہے اور ان کتابوں کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کے باعث ان کی بلند پایہ علمی شخصیت بین الاقوامی شہرت کی حامل بنتی۔ بے شک ان کی اس قسم کی تصانیف سے ملک اور بیرونِ ملک کے متعدد نامور علما اور اہلِ قلم متاثر ہوئے تاہم ان کا دائرۂ شہرت محدود ہی رہا۔

اصل میں ان کو بے مثال بین الاقوامی شہرت ان کی تحقیقات و تعلیقات کے باعث ملی۔ انھوں نے اس کام کا آغاز ۱۹۵۸ء کے آس پاس کیا اور پھر اسی کو اپنی زندگی کا

وظیفہ بنالیا۔ یہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں:

''مولانا نازک مزاج، ذکی الحس، لطیف الطبع اور دور اندیش انسان تھے۔ ۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا ان کی عمر ۶۰ سال کی تھی۔ طرح طرح کے عوارض و استقام لاحق ہو گئے تھے۔ قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعفِ بصارت، دورانِ سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو علمِ حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض و استقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا جو جوانی میں کرنے کا تھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ

''بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے''

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔'' (ترجمان الاسلام، بنارس، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۳۷)

مولانا حبیب الرحمٰن کی اس سلسلے کی پہلی کتاب حافظ ابن حجرؒ عسقلانیؒ کی ''انتقاء الترغیب والترہیب'' ہے۔ یہ مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں (ناسک) سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے حدیث کی قدیم کتابوں کی تلاش و جستجو اور تعلیقات و تصحیحات کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور مسلسل تیس سال تک اس پاکیزہ، نیک اور عظیم کام میں پوری دیانت داری، ایمانداری اور تندہی سے خلوصِ دل کے ساتھ مستغرق و منہمک رہے۔ اس استغراق و انہماک کے نتیجے میں انھوں نے حدیث کی کئی قدیم اور عظیم المرتبت کتابوں کی کھوج کی۔ انھیں حاصل کیا۔ اس پر شب و روز محنت اور

عرق ریزی کر کے ان کی از سرِ نو سائنٹفک انداز سے تدوین کی اور انھیں اشاعت کے لائق بنایا۔ ان کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کے باعث علمی تاریخ خصوصاً علمِ حدیث کے باب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے علمی و تحقیقی کارناموں کو آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان کی تصنیفات و تالیفات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ان کی وہ کتابیں شامل ہیں جو مختلف موضوعات پر انھوں نے اردو میں تحریر کی ہیں۔ دوسرے حصہ میں وہ کتابیں آتی ہیں جو حدیث کی قدیم کتابوں کی تلاش و تحقیق اور تعلیق و تصحیح سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ہم ان کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ابتدائی عمر کے رسائل:

مولانا حبیب الرحمٰن ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) سے ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) تک دارالعلوم، مئو (اعظم گڑھ) کے صدر مدرس رہے۔ اس دارالعلوم کی ۱۳۳۶ھ سے ۱۳۴۲ھ تک کی روداد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اس دور میں متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل علمی و مذہبی موضوعات پر قلمبند کئے تھے۔ روداد دارالعلوم، مئو (اعظم گڑھ) کے مرتب لکھتے ہیں:

> ''تصنیف و تالیف کے میدان میں دارالعلوم کا قدم اگرچہ ابھی تک پیچھے ہے لیکن دارالعلوم نے اس خدمت کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس میدان میں بھی زور آزمائی کی ہے اور اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ چنانچہ جناب مولوی ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ دارالعلوم جو بحالت عدم موجودگی صدر مدرس صاحب صیغۂ تعلیم کے نگراں و ذمے دار ہیں۔ جنہوں نے اسی مدرسے میں تکمیل

بھی کی ہے، حسب ذیل رسائل تالیف کر چکے ہیں:

(۱) الحجج القوية

(۲) السير الحسثيت

(۳) التوصية باسرار التسمية (عربی)

(۴) حدر اللثام عن وجه القراة خلف الامام

(۵) معجزات وکرامات

(۶) اسلام اور صنفِ نازک

(۷) کشف المعضلات فی ردِحل المغلقات

(۸) القول المختارفی التزی بزی لکفار

(۹) الروض المجودفی تقديم الركبتين عندالسجود

(۱۰) توطين الجائشة بشرح البناء بعائشة

(۱۱) تذكرة الادباء الهند (عربی)

(۱۲) الاتحافات السنية بذكرمحدثی الحنفيه (عربی)

وغیرہ جو بہت ضخیم اور عظیم المنفعت اور بعید المرتبت ہیں۔ اخیر کی دونوں کتابیں ہنوز زیرِ تالیف ہیں۔''

اس روداد کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے یہ رسالے ۲۳ یا ۲۴ سال کی عمر میں تالیف فرمائے تھے۔ گویا یہ ان کی ابتدائی عمر کا کارنامہ ہے۔ ہمیں نہ تو یہ رسائل دستیاب ہوئے اور نہ ہی ان کی تفصیلات فراہم ہوسکیں۔ اس لیے اس روداد کے اقتباس پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

دفع المجادله:

بمبئی کے شیعوں میں عید مباہلہ کے نام سے ایک بری رسم برسوں سے چلی آرہی تھی اور

وہ ہر سال اس کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ اس میں ناخواندہ سُنی حضرات بھی شرکت کرتے، جنہیں شیعہ حضرات یہ تعلیم دیتے کہ حضرت علیؓ افضل الصحابہ اور خلیفہ بلافصل ہیں۔ اس عقیدے کا مولانا عبدالشکور فاروقی نے آیاتِ مباہلہ کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر ابطال کیا۔ اس کتاب کے جواب میں ایک شیعہ عالم اعجاز حسین بدایونی نے برہان مجادلہ لکھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی کتاب دفع المجادلہ اس شیعہ عالم کی کتاب کا جواب ہے۔ اس میں انھوں نے آیتِ مباہلہ کی تفسیر بیان کی ہے اور شیعی عقائد کا پُر زور رد کیا ہے۔

الحاوی لرجال الطحاوی:

مولانا نے یہ زبردست علمی کارنامہ تقریباً تیس سال کی عمر میں انجام دیا۔ حافظ ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ (ف: ۳۲۱ھ) ایک عظیم المرتبت حنفی محدث گزرے ہیں۔ ان کی دو کتابیں شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار بہت ہی مشہور ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے ان دونوں کتابوں کے رجال ورواۃ کو جمع کر کے اس کتاب میں ان کے حالات تحریر کیے ہیں اور اس کی تکمیل کی تاریخ "**انہ وللہ تصنیف شریف**" سے نکالی ہے۔ اس سے ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) برآمد ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی تعریف وتوصیف علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے جلیل القدر علمانے کی ہے۔

التنقید السدید علی التفسیر الجدید:

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے پروفیسر خواجہ عبدالحئی نے التفسیر الجدیدؒ کے عنوان سے اسی دور میں ایک تفسیر شائع کی۔ اس میں انھوں نے جو تفسیری تحریفات کی تھیں مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنے اس رسالے میں اس کا پُر زور رد کیا اور آدم کی جنت، حیلۂ شرعی

اور تقلید وغیرہ مسائل کے متعلق عمدہ بحث کی۔ یہ رسالہ النجم لکھنؤ کے ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) کے شمارے میں ۴۸ صفحات پر شائع ہوا۔ اسے علمی حلقوں میں زبردست مقبولیت ملی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی ان الفاظ میں تعریف وتوصیف کی:

''احقر اشرف علی عفی عنہ، نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا ''**قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يحمل هذاالعلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين**" **(مشكوة عن البيهقى)** ماشاءاللہ قوتِ استدلال، حسنِ ادا، دفعِ شبہات، لینِ کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف، اس شعر کا نمونہ ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بارک اللہ تعالیٰ فی افادات المصنف وافاضتہ ۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون۔''

اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ نے ۲۸ رجب ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) کے ایک خط میں اس رسالے کی سراہنا ان الفاظ میں کی:

''سبحان اللہ عنوان اور معنون، تعبیر اور معبر عنہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر رسالہ ہے...... رسالہ کا موضوع باوجودیکہ تنقید ومناظرہ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس متانت وتہذیب اور انصاف وحق گوئی کا ثبوت اس تحریر میں دیا گیا ہے، عموماً مناظرانہ تحریریں اس سے خالی دیکھی گئی ہیں...... بہرحال رسالہ ہر حیثیت سے اپنے

موضوع میں جامع اور متین ومعقول ہے۔"

الاعلام المرفوعة فی حکم الطلقات المجموعة:

یہ کتاب پہلے مجلس علمی جامعہ مفتاح العلوم، مئو (اعظم گڑھ) کے زیرِ اہتمام اسی دور میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن میرے پیش نظر ہے جو ستمبر ۱۹۶۳ء میں تنویر پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں:

"چند دنوں کا واقعہ ہے کہ بنارس میں ایک حنفی المذہب نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ احناف سے اس نے مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیوی سے رجعت نہیں کر سکتا۔ لیکن اسی محلہ میں ایک اہلِ حدیث صاحب بھی رہتے تھے۔ انھوں نے اس کو بتایا کہ قرآن وحدیث کی رو سے رجعت جائز ہے۔ چنانچہ اس نے رجعت کر لی۔

احناف نے جب اہلِ حدیث صاحب سے گفتگو کی تو ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور کہا کہ ہمارے علما ایسا ہی کہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے بنارس ہی کے ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب سے فتویٰ لکھوا کر احناف کو دکھایا۔ احناف نے میرے پاس بھیج کر نفسِ مسئلہ اور اس فتوے کی حقیقتِ حال دریافت کی۔ احبابِ بنارس کی اس استدعا پر یہ رسالہ لکھا گیا ہے اور اس میں نفسِ مسئلہ کی ضروری تحقیق کے علاوہ اہلِ حدیث مولوی صاحب کی تقریباً ہر بات کا جواب اور دیگر مخالفین کی بھی قابلِ اعتنا باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔" (ص:۲)

اس کتاب میں مولانا نے ایک مجلس میں تین طلاقوں کے باب میں موافق اور مخالف دلائل پر محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ نیز احادیث اور آثار کی روشنی میں وقوع طلاقِ ثلاثہ پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت کیا ہے۔ یہ اس موضوع پر بڑی وقیع اور جامع تصنیف ہے۔ اس میں استدلال بہت قوی اور مضبوط ہے۔

تنبیہ الکاذبین:

مولانا عبدالشکور لکھنوی نے تنبیہ الحائرین کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں ایک شیعہ عالم مولانا اعجاز حسین بدایونی نے تنبیہ الناصبین کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی یہ کتاب اسی شیعہ عالم کی کتاب کے رد میں ہے، جو النجم لکھنؤ کے ۱۳۵۲ھ (۳۴-۱۹۳۳ء) کے مختلف شماروں میں بالاقساط شائع ہوئی ہے۔ اس میں شیعوں کے عقیدۂ تحریفِ قرآن کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

الازھار المربوعہ فی ردالآثار المتبوعہ:

یہ کتاب عمدۃ المطابع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اعلامِ مرفوعہ کے بعد ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔ یہ دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ پہلا حصہ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا۔

ہوا یہ کہ جب الاعلام المرفوعہ شائع ہوئی تو ایک غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ شائق نے الآثار المتبوعہ کے نام سے ایک کتاب اس کے جواب میں لکھی۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں اسی کتاب کا رد کیا ہے اور ان کی تمام باتوں کا نہایت مسکت جواب دیا ہے۔ اس میں بھی ایک مجلس کی تین طلاق کے واقع ہو جانے کا تشفی بخش ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ یوں یہ کتاب اعلام مرفوعہ کے موضوع سے منسلک ہے۔

نصرۃ الحدیث:

یہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے فتنۂ انکارِ حدیث کی تردید میں محققانہ کتاب ہے۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن نے منکرینِ حدیث کے اعتراضات کے دلائل سے پرخچے اڑا دیے ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۶ء) میں منظرِ عام پر آئی۔ بعد کو اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میرے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں مطبع معارف، اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ یہ ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ فاران کراچی کے ایڈیٹر ماہر القادری لکھتے ہیں:

> ''نصرۃ الحدیث کے مطالعے سے احادیث رسول اللہ کی اہمیت، افادیت، ضرورت بلکہ اس کے منصوص ہونے پر دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے۔ نصرۃ الحدیث کے فاضلانہ اور محققانہ مقدمے نے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے خطباتِ مدراس کی یاد تازہ کر دی ہے۔'' (فاران، جنوری ۱۹۶۳ء)

اس مدلل اور عظیم الشان کتاب میں مقدمے کے علاوہ اہم مشمولات یہ ہیں: فتنۂ انکارِ حدیث، انکارِ حدیث کا محرک، کتابتِ حدیث کی تاریخ، حفظِ حدیث کا اہتمام، روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط وغیرہ۔ ان عنوانات سے ہی کتاب کی افادیت، عظمت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی کتاب نے مولانا حبیب الرحمٰن کو عالمِ اسلام سے متعارف کرایا اور وہ ادب و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔

شارعِ حقیقی:

یہ رسالہ مولوی سید محمد کچھوچھوی کی کتاب التحقیق البارع فی حقوق الشارع کے جواب

میں ہے۔ سید محمد کچھوچھوی نے اپنی کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو احکامِ شرعی دینے میں مختارِ مطلق قرار دیا تھا اور یہ لکھا تھا وہ جس چیز کو چاہتے بلا حکمِ الٰہی اپنی طرف سے حلال یا حرام کر سکتے تھے۔ شارعِ حقیقی میں مولانا نے دلائل سے اس کا رد کیا ہے۔ یہ رسالہ ماہنامہ الفرقان (بریلی) کے ۱۳۵۷ھ (۳۹-۱۹۳۸ء) کے مختلف شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

احکام النذر الاولیاء اللہ:

یہ رسالہ بھی الفرقان (بریلی) کے شوال۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اولیاء اللہ کے لیے نذر و نیاز کی حقیقت و حرمت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسوم کو واضح کیا گیا ہے۔

ارشاد الثقلین:

یہ رسالہ شیعیت کے رد میں ہے۔ اس میں شیعوں کے ایک رسالے اتحاد الفریقین کا مدلل جواب دیا گیا ہے اور خلفائے راشدین کے درمیان باہمی اتحاد اور حضرت علیؓ کی نگاہ میں اپنے پیش رو خلفا کی عظمت کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ الداعی (لکھنؤ) کے شوال تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) کے شماروں میں شائع ہوا ہے۔

اہلِ دل کی دل آویز باتیں:

یہ رسالہ تصوف کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات ہیں۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور اپنے موضوع پر مکمل ہے۔ یہ ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں معارف پریس، اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ یہ تحریر

فرماتے ہیں:

”رسالے کی زیارت سے دل خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ طالبینِ علم و عمل کے لیے نافع فرمائے۔ وسیفعل انشاء اللہ تعالیٰ۔ طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لیے بہت مفید ہے۔“

ابطالِ عزاداری:

یہ رسالہ بھی شیعیت کے رد میں ہے۔ الداعی (لکھنؤ) کے جمادی الآخر تا ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ اسے مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کی فرمائش پر قلمبند کیا تھا۔ اس میں تعزیہ داری اور عزاداری کے دیگر مراسم پر سنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحقیقِ اہلِ حدیث:

یہ رسالہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن نے آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس۔ مئوائمہ (اعظم گڑھ) منعقدہ اپریل ۱۹۴۳ء کے اس خطبۂ صدارت میں موجود بے بنیاد دعووں کی حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے جو مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی نے کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس کی روح حسبِ ذیل ہے:

۱۔ اہلِ حدیث نام پیغمبر علیہ السلام کا مقرر فرمایا ہوا ہے۔

۲۔ یہ نام صحابہ کرام کا قبول کردہ ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے کو اہلِ حدیث کہا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو اہل حدیث کہا گیا۔ امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ اہلِ حدیث تھے۔

۳۔ سفیان ابن عینیہ نے لکھا ہے کہ پہلے پہل امام ابوحنیفہ نے ہی مجھ کو اہلِ حدیث بنایا۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر دعوؤں کی سچائی کو مولانا حبیب الرحمٰن نے بے نقاب کیا ہے اور ہر ایک کا دلیل سے جواب دیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۴۳ء میں ہی اکبر پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔

رکعاتِ تراویح:

یہ کتاب مجلسِ علمی جامعہ مفتاح العلوم، مئو (اعظم گڑھ) کے زیرِ اہتمام پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ میرے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ جو تنویر پریس لکھنؤ سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں مولانا حبیب الرحمٰن نے پُرزور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام عالمِ اسلام میں فاروق اعظمؓ کے زمانے سے برابر بیس یا بیس سے زائد رکعتوں پر عمل درآمد رہا ہے اور بیس والی مرفوع روایت کو یکسر نا قابلِ اعتبار کہنا اور آٹھ کی روایتوں کی تصحیح اور ان پر اعتماد از روئے تحقیقِ اصولِ حدیث و مسلمات مخالفین کی روشنی میں قطعاً صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے صحیح اور مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ گزشتہ بارہ سو برس کی تاریخ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمانوں نے آٹھ رکعت تراویح پڑھی ہے۔ دراصل یہ کتاب اہلِ حدیث کے زور و شور کے رد میں ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی لکھتے ہیں:

> ''مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی وقیع اور نازک نکاتِ فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپردِ قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ ان کی قوتِ حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں لیکن ان کی رشحاتِ قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت اور وہی شان نقد ہے......

رکعاتِ تراویح ایک بیش بہا کتاب ہے۔ ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے (بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو) انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلکِ حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے۔" (ماہنامہ تجلی، دیوبند، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص: ۵۶-۵۵)

مشاہیر علمائے کرام نے بھی اس کتاب کو بے انتہا پسند فرمایا۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مدعیانِ حدیث کی گندم نمائی اور جو فروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص اس غلطی میں مبتلا تھے کہ آٹھ رکعاتِ تراویح کا ثبوت شرعی موجود ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی اس حقیقت نمائی نے جو موصوف نے اس رسالے میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی دھجیاں اڑا دیں اور کالشمس فی رابعۃ النہار ظاہر کر دیا کہ مدعیانِ حدیث کے دعاویِ باطلہ ہرگز قابلِ التفات نہیں ہیں۔ میں نے رسالہ مذکور کو ابتدا سے انتہا تک مطالعہ کیا ہے۔ میں حضرت مولف ممدوح کی تحقیقاتِ انیقہ اور دلائلِ قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے ان مدعیوں کے خرمنہائے تزویر پر صواعقِ محرقہ برسا کر نیست و نابود کر دیا ہے۔"

یہ کتاب رکعاتِ تراویح کے باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں خالص علمی و تحقیقی اندازِ استدلال ملتا ہے۔

اعیان الحجاج:

یہ اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ اس میں اکابرین امت اور شاہان اسلام کے حج و

زیارت کے دلچسپ اور بصیرت افروز واقعات اور ان کی زندگی کے پاکیزہ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ پہلی جلد تنویر پریس، امین آباد پارک، لکھنؤ سے مارچ ۱۹۵۸ء میں چھپی۔ یہ ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں پیش لفظ وتعارف کے عنوان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کتاب کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ تمہیدی کلمات کے بعد لکھتے ہیں:

> ''فاضلِ گرامی، محدثِ جلیل، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے سید الانبیا اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام سے لے کر صحابہ کرام، تابعین عظام اور خیر القرون کے ان ائمہ وصلحا واکابر کے سفرحج کے واقعات جمع فرمائے جو تاریخِ اسلام اور سوانح وتراجم کے صحیفوں میں منتشر ومتفرق تھے۔ ان واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے محدثانہ ذوق کی بنا پر ان مفید معلومات اور تاریخی وعلمی واقعات کو بھی ضمناً ذکر فرما دیا جس سے اس کتاب کی قدر وقیمت وافادیت دوبالا ہوگئی۔ محض یہ ضمنی معلومات اور تاریخی واقعات خود ایک بڑا علمی سرمایہ وذخیرہ ہیں اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علمی ذوق اور تاریخی نظر عطا فرمائی ہے وہ ان کی افادیت اور علمی قدر وقیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف عازمینِ حج، عوامِ مومنین بلکہ اہلِ علم ونظر کے لیے بھی ایک بڑا قیمتی علمی صحیفہ بن گئی ہے۔'' (ص: ۸)

اس کتاب میں تاریخ اسلام کے تقریباً دو سو بلند پایہ حجاج کرام کا ذکر موجود ہے۔ اس کی دوسری جلد اٹھارہ سال بعد ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) میں اسرار کریمی پریس، الہٰ آباد سے شائع ہوئی۔ اس میں امت کے ۱۳۶۸ افراد کے سوانح اور ان کے حج وزیارت کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ۳۱۴ صفحات پر محتوی ہے۔

رکعاتِ تراویح مذیل:

مولانا کی کتاب رکعات تراویح کے جواب میں ایک غیر مقلد عالم نے انوار مصابیح کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مولانا نے رکعاتِ تراویح مذیل میں اس کتاب کا رد کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰ء) میں تنویر پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

رہبرِ حجاج:

اس میں آسان زبان میں حج وزیارت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور بعض مسائل کی عمدہ تحقیق کی گئی ہے۔ یہ کتاب اکلیل پریس، بہرائچ (یوپی) سے فروری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۶۲ صفحات پر محتوی ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ معارف، (اعظم گڑھ) لکھتا ہے:

> ”حج کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حج کے مسائل بہت اچھے اور آسان انداز میں بیان کئے ہیں۔ حج وزیارت کے سلسلے میں بعض غیر شرعی اور مروجہ رسموں پر بھی مولانا نے حرف گیری کی ہے اور اختصار کے باوجود بعض مسائل پر عالمانہ بحث بھی کی ہے۔ خاص طور پر عصر وفجر کے بعد طواف کی دو رکعتوں پر بڑی مدلل بحث کی ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہے۔“ (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۳ء)

دستکار اہلِ شرف (تذکرۂ نساجین):

مولانا کی یہ قدیم کتاب برہان پور کے الحاج امین اللہ مولوی امانت اللہ کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں حسن پریس دار العلوم روڈ، منو (اعظم گڑھ) سے شائع ہوئی۔ ۱۳۲ صفحات

پر مشتمل اس کتاب میں دست کاری کو ذریعۂ معاش بنانے کے سلسلے میں جو فضیلت اور تاکید احادیث میں بیان ہوئی ہے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بعد امت کے تقریباً ۱۲۱۰ اکابر اور مشاہیر کا جو پارچہ بافی کے کام سے وابستہ تھے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں کفو کے مسئلے کی تحقیق بھی آ گئی ہے، جو قابلِ تعریف ہے۔

تحقیقات وتعلیقات:

مولانا حبیب الرحمٰن نے علمِ حدیث اور فنِ اسماء الرجال میں مہارت حاصل کرنے کے بعد پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ حدیث کی قدیم نایاب کتابوں کی تحقیق و تعلیق اور تصحیح کا کام ۱۹۵۸ء کے آس پاس شروع کیا اور اخیر وقت تک اسی میں مصروف رہے۔انھوں نے حدیث کے پرانے ذخیروں کی تلاش میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کویت، بیروت، مصر، دمشق اور بحرین کا سفر کیا۔وہاں سے مخطوطات حاصل کیے اور اسے سائنٹفک انداز سے مدون کر کے دنیا کے سامنے احادیث کا وہ عظیم الشان، قابلِ تکریم اور عظیم المرتبت ذخیرہ پیش کیا جس کو دیکھ کر ہند اور بیرونِ ہند کے ممتاز علماء اور اہلِ قلم حیران رہ گئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنی تحقیقات وتعلیقات میں ایک ایک لفظ کی تحقیق، غریب ومشکل الفاظ کی تشریح اور روایت کے راوی کی نشاندہی میں کافی عرق ریزی کی ہے۔انھوں نے بوسیدہ، ناصاف اور گنجلک نسخوں کو پڑھ کر نقل کیا۔ان کی تصحیح کی اور ان پر عالمانہ اور محققانہ مقدمے لکھے۔انھوں نے حدیث کی جن قدیم کتابوں کو مدون کیا ہے یہاں ان پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

انتفاء الترغیب والترھیب:

امام ابو محمد عبدالعظیم منذری شامی مصریؒ (ف:۶۵۶ھ) ساتویں صدی ہجری کے ایک

مشہور و معروف عالم گزرے ہیں۔ کتاب الترغیب والترہیب ان کی حدیث کی ایک بے مثل کتاب ہے۔ اس کتاب کا انتقاء و اختصار حافظ ابن حجر عسقلانی (ف: ۸۵۲ھ) نے کیا تھا۔ یہ کتاب مخطوطے کی صورت میں تھی اور زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن کو اس کا پہلا قلمی نسخہ شاہ نعیم اللہ بہرائچیؒ کے کتب خانے میں ملا۔ اس کے بعد دوسرا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا اور تیسرا نسخہ دارالعلوم، دیوبند کے کتب خانہ میں ملا۔ ان نسخوں کی فراہمی کے بعد انھوں نے ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور دارالعلوم، دیوبند کے نسخے کو اصل قرار دے کر اس کے حاشیے میں اختلافِ نسخ کو بیان کیا۔ اغلاط کی تصحیح کی اور امام منذریؒ کی اصل کتاب الترغیب و الترہیب کو پیشِ نظر رکھ کے تعلیق و تصحیح فرمائی۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں احیاء المعارف، مالیگاؤں (ناسک) سے ۲۲۵ صفحات پر شائع ہوئی۔ بعد کو مکتبہ الغزالی دمشق نے اسے اہتمام سے طبع کیا۔

کتاب کے شروع میں ایک جامع مقدمہ ہے جس میں ترغیب و ترہیب سے متعلقہ حدیثیں جمع کرنے کی جامع تاریخ بیان کی گئی ہے اور کتاب کے اصل مصنف علامہ عبدالعظیم منذریؒ اور حافظ ابن حجرِ عسقلانیؒ کی مختصر سوانح حیات قلمبند کی گئی ہے۔

المسند الحمیدی:

مسند حمیدی امام بخاریؒ کے استاد محترم امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدیؒ (ف: ۲۱۹ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ صحیح بخاری کا ماخذ ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی سعی و کوشش سے یہ غیر مطبوعہ عظیم المرتبت کتاب ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

اس کتاب کی تعلیق و تصحیح میں حضرت مولانا نے نہ صرف احادیث کی تخریج کی ہے بلکہ فقہی ترتیب پر احادیث کی فہرست بھی تیار کر دی ہے۔ اس پر قاضی اطہر مبارکپوری

تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسند حمیدی کو ان کے معتمد تلامذہ نے ان سے روایت کی ہے جن میں بشر بن موسیٰ اسدی (متوفی ۲۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں۔ دوسرے راوی ابو اسمٰعیل سلمی (متوفی ۲۸۰ھ) ہیں۔ان دونوں حضرات کے علاوہ بقول ابن حجر ''غیر واحد'' نے حمیدی سے روایت کی ہے مگر آج دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسند حمیدی کا جو مخطوطہ ملتا ہے وہ صرف بشر بن موسیٰ کی روایت کا ہے اور اسی نسخے کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مرتب اور مدون فرمایا اور مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۸۲ھ، ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) میں پہلی بار شائع کیا۔ مولانا کو اس کے چار قلمی نسخے مل سکے تھے۔ ایک کتب خانہ دار العلوم دیو بند میں جو ۱۳۲۴ھ کا مکتوبہ تھا۔ دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدر آباد میں جو ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں جو ۱۱۵۹ھ کے پہلے کا مکتوبہ تھا۔ کیوں کہ اس میں ۱۱۵۹ھ پھر ۱۱۵۹ھ میں کسی کی ملکیت میں آنے کی تاریخ تحریر ہے اور چوتھا دار الکتب الظاہریہ دمشق میں جو مائکروفلم کے ذریعہ طباعت کے دوران ملا اور مولانا نے اس سے بھی استفادہ کیا۔ ویسے دیوبندی اور سعیدی نسخوں کو اصل قرار دے کر کتاب کی تصحیح و تعلیق کی ہے۔

مولانا نے اس کتاب کی تصحیح نہیں کی ہے بلکہ اس کی احادیث کی تخریج بھی کی ہے۔ یعنی یہ بتایا کہ اس کی احادیث بعد کی کتب احادیث میں کن کن کتابوں میں کہاں موجود ہیں۔ کن طریق سے آئی ہیں اور ان میں کیا اختلاف ہے ...... ساتھ ہی جہاں

ضرورت محسوس ہوئی غریب الفاظ کی شرح وتوضیح بھی کردی ہے۔ابتدامیں ان صحابہ کی ترتیب وارفہرست ہے جن کی مسانید اس کتاب میں موجود ہیں۔ پھر فقہی ترتیب پر احادیث کی فہرست بڑی عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے اور مختلف مسانید کی احادیث کوایک باب میں بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد اعلام وامکنہ کی فہرست ہے۔پھر پُر مغز مقدمہ ہے جس میں امام حمیدی اور مسند حمیدی کے رواۃ کے حالات وغیرہ درج ہیں۔"

(مآثرومعارف،ص:۲۰۴)

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نے مسند حمیدی کی تعلیق وتحقیق اور اس کی تصحیح میں بڑی دقت نظری سے کام لیا ہے۔یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس کتاب کی دونوں جلدیں ہمارے پیشِ نظر ہیں اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولانا کا طرزِ تحقیق عصر حاضر میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے بہت اونچا اور جامع ہے۔

اس کی پہلی جلد شعبان المعظم ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳ء) میں مطبع لجنۃ نشر العلوم الاسلامیہ، حیدرآباد دکن، ترب بازار، حیدرآباد سے شائع ہوئی۔اصل کتاب ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے شروع اور آخر میں جو معلومات عنوانات کے تحت درج ہیں ان میں ہر عنوان کے صفحہ نمبر علاحدہ ہیں۔دیکھئے:

اس طرح یہ مکمل کتاب کل ۲۸۶ صفحات پر محتوی ہے۔ سائنٹفک تحقیق کے اعتبار سے یہ قابلِ قدر ہے۔

اس کتاب کی دوسری جلد (الجزء الثانی) ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) میں چھپی۔ اسلامک پبلی کیشنز سوسائٹی پریس، حیدرآباد سے اس کے ۳۲۰ صفحے اور بقیہ صفحات علمی پریس، مالیگاؤں سے شائع ہوئے۔ یوں اس کتاب کی طباعت کا کام دو مطابع میں ہوا ہے۔ محتویات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اس لحاظ سے اس کتاب کی ضخامت ۳۵۸ صفحات ہوتی ہے۔ کتاب کی دونوں جلدوں میں کل تیرہ سو حدیثیں شامل ہیں۔ اس کو اہلِ علم میں بے انتہا مقبولیت ملی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کے موقر جرائد و رسائل میں اس پر موثر اور جامع تبصرے شائع ہوئے۔

کتاب الزهد والرقائق:

یہ اپنے موضوع پر ایک عظیم کتاب ہے اور علمائے اسلام کے قدیم ترین دورِ تصنیف و تالیف سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مصنف امام عبداللہ بن مبارک المروزی (ف: ۱۸۱ھ) ہیں۔ چوں کہ یہ مخطوطے کی صورت میں تھی اس لیے بہت سے کبار اہلِ علم نے فقط اس کا نام ہی سنا تھا اور ہمیشہ اس کی زیارت سے محروم رہے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''قدما میں صرف ایک بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے۔ جنہوں نے کتاب الزہد والرقائق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے مگر یہ ہیچمدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے اس لیے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کرسکتا۔''
> (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۴ء، ص: ۲۰۵)

مولانا حبیب الرحمٰن نے سعی و کوشش کے بعد اس کتاب کو بھی ڈھونڈ نکالا اور مختلف مخطوطے کے فوٹو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح کی اور تعلیقات وحواشی کے ساتھ اسے منظر عام پر لائے۔ اس طرح یہ بے مثل کتاب علمائے کرام تک پہنچی۔ مولانا کی اس تلاش و تحقیق کو مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنے ایک مضمون ''مولانا کی خدمت حدیث کا عہد زریں'' میں تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس نادر و عظیم کتاب کا قلمی نسخہ مکتبہ ولی الدین جار اللہ استنبول

میں تھا جس کا عکسی فوٹو حاکم قطر شیخ علی بن عبداللہ نے اپنے مکتبہ کے نادرو مخطوطہ کتابوں کے لیے حاصل کیا تھا اور چوں کہ یہ کام حاکم قطر کی اجازت ومرضی سے ہوا تھا اس لیے مولانا نے مقدمے میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ نیز قاہرہ کے معہد مخطوطات سے اس کتاب کے تین فوٹو مجلس احیاء المعارف کے ذریعے آئے۔ ان سب سے مولانا نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ کتاب الزہد کے دو نسخے تھے ایک ابو عبداللہ حسین بن حسن بن حرب مروزی نزیل مکہ متوفی ۲۴۶ھ کا جو ۵۶۴ صفحات میں ہے۔ دوسرا نسخہ ابو عبداللہ نعیم بن حماد مروزی مصری متوفی ۲۸۸ھ کا جو درحقیقت مروزی کے نسخہ پر زیادات ہے۔ یہ ۱۳۲ صفحات میں ہے۔ مولانا نے اس کی تعلیق وتصحیح میں بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں ان کے روحانی اور احسانی ذوق کی پوری جھلک موجود ہے۔ زہد کے موضوع پر نہایت وقیع معلومات جمع کی ہیں۔ امام اعبداللہ بن مبارک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کیے ہیں۔ کتاب الزہد کے راویوں کے تراجم کی تحقیق کی ہے۔ کتاب کے موضوعات، اس کی مسند و مرفوع احادیث، موقوفات صحابہ، موقوفات تابعین وتبعِ تابعین، حضرت انبیا اور ان کی احادیث کی علٰحدہ علٰحدہ مفصل فہرست مرتب کی ہے جو بجائے خود نہایت دقت اور محنت طلب کام ہے۔ آخر میں استدراک و تعقبات ۱۵ صفحات میں دیے ہیں جن میں نہایت نادر و نایاب معلومات ہیں۔ اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں پچاس کتابوں کی فہرست بھی دے دی ہے۔ الغرض یہ کتاب مولانا کے علم وتحقیق

اور حدیث وفقہ اور رجال میں تبحر کا مظہر بن گئی ہے اور اس آئینے میں ان کے علمی کمالات کی پوری عکاسی ہے۔ تعلیقات میں احادیث کی تخریج کر کے بتایا ہے کہ مشہور و متداول احادیث کی کتابوں میں یہ حدیث کن کن کتابوں میں ہیں۔ مشکل الفاظ کی شرح کی ہے۔ سند رجال پر روشنی ڈالی ہے۔ نسخوں کے اختلاف درج کیے ہیں۔" (ماہنامہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۴۲-۴۱)

یہ کتاب مولانا کی تحقیق، تعلیق اور تصحیح کے ساتھ مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں (ناسک) کے زیر اہتمام ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اشاعت کے بعد جوں ہی یہ مذہبی اور علمی حلقوں میں پہنچی اس کا زبردست استقبال کیا گیا اور اس کی ترتیب و اشاعت پر تمام عالمِ اسلام سے مولانا کو بے انتہا داد و تحسین ملی۔ چنانچہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کے ایڈیٹر شذرات کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"مرتب، کی محنت اور تلاش و تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ اس کی کتابت ترتیب و اشاعت سے ایک مفید اور اہم دینی خدمت انجام پائی ہے جس کے لیے فاضل مرتب اور ناشر دونوں اہلِ قلم کے شکریے کے مستحق ہیں۔" (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۶۷ء، ص: ۳۲۴)

اس کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے شاہ معین الدین ندوی معارف، اعظم گڑھ کے باب التبصرہ میں لکھتے ہیں:

"زہد و رقائق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دوسری ہجری کے نامور محدث حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق سب سے قدیم اور اہم ہے۔ یہ اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ اس کے

قلمی نسخے دنیائے اسلام کے چند ہی کتب خانوں میں تھے۔
فاضلِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے جو اس سے پہلے بھی حدیث کی بعض اہم کتابوں کو ایڈٹ کر چکے ہیں۔ اس کتاب کو مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ وتصحیح وتحشیہ کے بعد شائع کیا ہے۔
شروع میں ایک جامع اور مبسوط مقدمہ ہے۔ اس میں زہد کی حقیقت چھٹی صدی ہجری تک، اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ، مصنفِ کتاب کے مفصل حالات، علمی ودینی کمالات کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت، اس کے تین مختلف نسخوں اور ان کے رواۃ کے مختصر ترجمے اور دوسرے مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں۔ حواشی وتعلیقات، اختلافِ نسخ، آیتوں کے حوالے، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ کی تشریح، دوسری مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں کی تخریج، اس کے مرویات کی ان سے مطابقت واختلاف ظاہر کر کے ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پوری کتاب گیارہ اجزا اور بروایت مروزی ۱۶۲۷ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ فاضل مرتب نے دوسرے نسخے کی زیادت کو جن کی تعداد ۴۳۶ ہے اور نعیم بن حماد سے مروی ہے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ شروع میں تینوں نسخوں کے عکسی فوٹو اور ۲۰ صفحات میں مختلف فہرستیں دے کر استفادہ اور مراجعت کو آسان کر دیا گیا ہے۔
غرض یہ کتاب تہذیب وتدوین، تہذیب وتحشیہ اور تحقیق وتعلیق کے جملہ لوازم سے آراستہ اور اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ اور موضوع ومطالب کے اعتبار سے اہلِ دل کی طمانیت وسکون کا

سامان ہے۔" (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۶۷ء،
ص:۱۰۶-۱۰۵)

یہ بے مثل کتاب بھی میرے پیشِ نظر ہے۔اس کی فہرست دیکھئے:

اس تفصیل سے کتاب کی ضخامت ۸۰۴ صفحات ہوتی ہے۔

کتاب السنن:

کتاب السنن دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مشہور و معروف محدث الامام الحافظ سعید بن منصورؒ بن شعبۃ الخراسانی المکی (ف:۲۲۷ھ) کی تالیف ہے۔ صاحب موصوف ایک بلند پایہ محدث تھے۔ان سے استفادہ کرنے والوں میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام داؤدؒ اور احمد بن حنبلؒ جیسے کبار محدثین بھی شامل ہیں۔

ان کی یہ تالیف کتاب السنن، احادیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سرمائے میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ علمائے اسلام نے ہمیشہ اس سے فیض حاصل کیا لیکن افسوس کہ حدیث کی بعض دیگر کتابوں کی طرح یہ بھی ایک طویل عرصہ تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی اور نہ ہی مکمل مخطوطے کی صورت میں کہیں محفوظ رہ سکی۔

حسنِ اتفاق سے پیرس کے ڈاکٹر حمید اللہ کو ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں ترکی کے کتب خانے محمد پاشا کوبریلی سے اس کتاب کی تیسری جلد کا ناقص نسخہ فراہم ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے اس نسخے کی تصحیح و تعلیق کا سارا کام انجام دیا۔ اس سلسلے میں قاضی اطہر مبارک پوری نے جو تفصیلات بتائی ہیں انھیں یہاں تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے:

''حضرت امام عثمان سعید بن منصور خراسانی (ف: ۲۲۷ھ) محدثینِ کرام کے طبقۂ اول سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی کتاب السنن احادیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سرمائے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہمیشہ سے علمائے اسلام میں مقبول و متداول رہی ہے۔ مگر حدیث کی بعض دوسری قدیم کتابوں کی طرح یہ بھی اب تک طبع ہو کر سامنے نہ آسکی تھی۔ اب محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدر آبادی ثم فرنساوی کی کوشش سے اس کی تیسری جلد ۱۳۸۰ھ میں ترکی کے کتب خانہ محمد شاہ کوبریلی سے دستیاب ہوئی ہے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ اس کی طباعت مجلس علمی، ڈابھیل اور کراچی سے ہو رہی ہے۔

امام سعید بن منصور کی جلالتِ شان کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک طرف ان کے اساتذہ شیوخ میں امام مالک، امام لیث ابن سعد، امام سفیان بن عیینہ اور امام حماد بن زید جیسے ائمۂ حدیث ہیں تو دوسری طرف ان کے حلقۂ درس سے امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔ ان کی کتاب السنن کی شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی نسبت سے ''صاحب السنن'' مشہور ہوئے۔ سنن پر ایسی کتاب

بہت کم محدثین نے لکھی ہے۔ ہر موضوع پر احادیث رسول اللہ
صل اللہ علیہ وسلم، آثار صحابہؓ کا جو سرمایہ اس کتاب میں ملتا ہے
اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ اس کی ضخامت کا
اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کی تیسری جلد کا جو ناقص نسخہ
دستیاب ہوا ہے وہ تعلیق وتحشیہ کے بعد تقریباً نوسوصفحات میں
آیا اور طباعت کے بعد اس کی ضخامت بارہ سوصفحات ہوگی۔''
(مآثر ومعارف، ص: ۲۱۰-۲۰۹)

دریافت شدہ مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے قاضی اطہر مبارکپوری مآثر ومعارف
(ص: ۲۲۰، ۲۲۱) میں لکھتے ہیں:

''یہ مخطوطہ نہایت خوش خط ہے۔ اس کی پشت پر مصنف ابن ابی
شیبہ درج ہے مگر اندرونی شہادتوں سے پتہ چلا کہ یہ سنن سعید بن
منصور کا ٹکڑا ہے۔ اس جلد میں حسب ذیل ابواب وکتب ہیں:

۱۔ باب الحث علی تعلیم الفرائض من کتاب الفرائض۔
۲۔ کتاب ولایة العصبه۔
۳۔ کتاب الوصایا۔
۴۔ کتاب الطلاق۔
۵۔ کتاب الجهاد۔

یہ نسخہ ربیع الاول ۷۲۵ھ میں دمشق کے قریب عبادیہ نامی قریہ
میں محمد بن احمد بن علی خطیب کے قلم سے لکھا گیا ہے۔
اس جلد میں اسلام کے شخصی قوانین اور عائلی زندگی کے بارے
میں بہت سے ایسے واقعات اور احادیث اور آثار موجود ہیں جو
حدیث کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ کتاب الجہاد میں عہد صحابہ

کے بین الاقوامی امور ومعاملات سے متعلق عہدنامے پائے
جاتے ہیں جن سے رومیوں اور ایرانیوں اور خلافت اسلامیہ
کے تعلقات و معاملات کی نوعیت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی
ہے۔اس کے مکمل نسخے کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔صرف
تیسری جلد کا ناقص نسخہ دستیاب ہوسکا ہے۔''

مولانا حبیب الرحمٰن نے اس تیسری جلد کی تعلیق وتصحیح کا کام دوحصوں میں مکمل کیا ہے
اوراسے القسم الاول من المجلد الثالث اور القسم الثانی من المجلد
الثالث کا عنوان دیا ہے۔

القسم الاول کی اشاعت مطبع علمی پریس، مالیگاؤں (ضلع ناسک) سے ۱۳۸۷ھ
(۱۹۶۷ء) میں ہوئی اوراس کی اشاعت کا اہتمام مجلس علمی، ڈابھیل (گجرات) نے
کیا ہے۔اس کتاب کے مشمولات حسب ذیل ہیں:

۱۔ کلمته المحقق – حبیب الرحمن الاعظمی	۸-۱
۲۔ المقدمه – من الاستاذالدکتور حمیدالله	۱۸-۱
۳۔ فهرس ابواب القسم الاول من مجلدات الثالث	۸-۱
۴۔ عکس مخطوطه	۲-۱
۵۔ اصل کتاب – کتاب السنن۔	۴۱۰-۱
۶۔ جریدة المراجع	۵-۱
۷۔ التعقیب والاستدراك	۵-۱
۸۔ تصویب الاخطاء	۸-۱

اس طرح یہ کتاب ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ۷۶۲ سنن شامل ہیں۔
القسم الثانی علمی پریس مالیگاؤں (ناسک) سے ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) میں شائع ہوئی۔
اس کی اشاعت کا اہتمام بھی مجلس علمی، ڈابھیل (گجرات) نے کیا ہے۔اس کتاب

کے محتویات اس طرح ہیں:

۱- فهرس ابواب الكتاب	۱-۹
۲- درر الفدائد المنتشره - ممالم يبوب عليه المصنف	۱-۱۳
۳- اصل كتاب -كتاب السنن	۱-۳۷۸
۴- الاستدراك - القسم الاول	۳۷۹
۵- تصويب الاخطاء	۳۸۰-۳۸۴

اس حساب سے اس کتاب کی ضخامت ۴۰۰ صفحات ہوتی ہے۔ اس حصہ میں ۱۲۱۶ سنن شامل ہیں۔ اس طرح کل سنن کی تعداد ۲۹۷۸ ہوتی ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد صدق جدید کے ایڈیٹر اور مشہور و معروف مفسرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کے متعلق اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا:

> ''حیرت ہوتی ہے کہ ان میں (محدث اعظمی میں) اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے۔'' (صدق جدید، لکھنؤ، ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص:۴)

مجمع بحار الانوار:

مولانا محمد طاہر پٹنی (ف:۹۷۷ھ) اکبر اعظم کے دورِ حکومت میں ایک زبردست عالمِ دین ہوئے ہیں۔ مجمع بحار الانوار انھی کی ایک مشہور و معروف تصنیف ہے جو حدیثِ رسولؐ کے لغت پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مطبع نولکشور، لکھنؤ سے کئی بار شائع ہوئی جو اغلاط سے پُر تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کو سب سے پہلے اس کا احساس ہوا اور انھوں نے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کی۔ یہی نہیں بلکہ اس کو ازسرِ نو ایڈٹ بھی کیا۔ یہ کتاب جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) سے ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۶ء)

کے درمیان مجلس دائرۃ المعارف، حیدر آباد سے شائع ہوئی۔

المصنف(عبدالرزاق):

مولانا حبیب الرحمٰن کا سب سے اہم اور عظیم تحقیقی کارنامہ المصنف کی تعلیق وتدوین ہے جو حافظ الکبیر ابوبکر عبدالرزاق بن ھمام صنعانی (پیدائش:۱۲۶ھ۔وفات:۲۱۱ھ) کی تصنیف ہے۔گیارہ جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم کتاب بہت ہی حاوی اور جامع حدیث کا مجموعہ ہے۔اس میں احادیث مرفوعہ کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بھی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔یہ فقہ حنفی کے لئے ایک مفید اور معلوماتی ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ کتاب بھی صدیوں سے نایاب تھی۔مخطوطے کی صورت میں گنتی کے کتب خانوں کی زینت تھی۔مولانا نے پیرانہ سالی اور امراض کے باوجود اس عظیم تحقیقی کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنے صاحبزادے مولانا رشید احمد کی مدد سے اسے درجۂ تکمیل تک پہنچایا۔اس کتاب کی تحقیق وترتیب میں مولانا نے نہ صرف احادیث کی تخریج اور غریب ونامانوس الفاظ کی وضاحت کی ہے بلکہ اعلام وامکنہ کی فہرست بھی دی ہے۔

یہ کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں مجلسِ علمی، ڈابھیل (گجرات) کے زیر اہتمام ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) سے ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) کے درمیان دار القلم پریس، بیروت (لبنان) سے شائع ہوئی ہے۔اس کی اشاعت کے سلسلے میں حضرت مولانا نے دوبار بیروت کا سفر کیا اور اپنی نگرانی میں اس کی اشاعت کا کام مکمل کروایا۔اس کی پہلی جلد ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں منظر عام پر آئی۔اس میں حدیث نمبر ۱ سے حدیث نمبر ۲۲۴۴ تک موجود ہے۔اس کے مشمولات اس طرح ہیں:

۱۔	کتاب کی تفصیلات	۱-۶
۲۔	مقدمة الناشر	۷-۸
۳۔	الفهرست	۹-۱۹

۴۔ الرموز المستعمله فی حواشی الکتاب ۲۰-۰

۵۔ عکوس المخطوطات ۱-۴

۶۔ المصنف ۱-۵۹۰

اس جلد میں کتاب الطھارہ، کتاب الحیض اور کتاب الصلوٰۃ ہے۔ دوسری جلد کا سال اشاعت بھی ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) ہے۔ اس میں حدیث نمبر ۲۲۴۵ سے حدیث نمبر ۴۵۶۶ تک ہے۔ اس کی ابتدا میں ۱۴ صفحات پر مشتمل ضروری معلومات اور فہرست ہے۔ اصل کتاب المصنف ۵۸۴ صفحات پر محتوی ہے۔ اس جلد میں صرف "کتاب الصلوٰۃ" ہے۔

تیسری جلد ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں شائع ہوئی۔ اس میں حدیث نمبر ۴۵۶۷ سے ۶۷۹۱ تک ہے۔ اس کتاب کے محتویات حسب ذیل ہیں:

۱۔ تفصیلات والفھرست ۱-۱۶

۲۔ عکوس المخطوطات ۱-۴

۳۔ المصنف ۱-۶۰۰

اس میں بقیۃ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ، کتاب صلوٰۃ العیدین، کتاب فضائل القرآن اور کتاب الجنائز شامل ہے۔

چوتھی جلد ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۲ء) میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں حدیث نمبر ۶۷۹۲ سے حدیث نمبر ۸۷۹۵ تک شامل ہے۔ یہ احادیث کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصیام، کتاب العقیقہ، کتاب الاعتکاف اور کتاب المناسک میں منقسم ہیں۔ کتاب کی ترتیب اس طرح ہے:

۱۔ تفصیلات والفھرست ۱-۱۶

۲۔ المصنف ۱-۵۴۲

پانچویں جلد میں حدیث نمبر ۸۷۹۶ سے حدیث نمبر ۹۸۱۶ تک موجود ہے۔ ان

حدیثوں کا تعلق بقیہ کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجہاد اور کتاب المغازی سے ہے۔ یہ جلد بھی ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کی ضخامت تفصیلات والفہرست (ص: ا سے ص: ۱۶) کے علاوہ ۵۰۲ صفحات ہے۔ یوں یہ ۵۱۸ صفحات پر محتوی ہے۔

چھٹی جلد میں کتاب اہل الکتاب، کتاب النکاح اور کتاب الطلاق ہے۔ اس میں ۹۸۱۷ سے حدیث نمبر ۱۱۹۴۴ تک ہے۔ ابتدا میں صفحہ نمبر ا سے صفحہ نمبر ۲۰ پر کتاب کی تفصیلات اور الفہرست ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب المصنف صفحہ نمبر ا سے شروع ہوتی ہے اور یہ صفحہ نمبر ۵۲۶ پر تمام ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) میں ہوئی۔

ساتویں جلد میں پورے طور سے کتاب الطلاق کا بقیہ حصہ ہے۔ اس میں حدیث نمبر ۱۱۹۴۵ سے حدیث نمبر ۱۴۰۵۳ تک موجود ہے۔ یہ جلد تفصیلات، الفہرست اور کتاب کے اصل متن سمیت ۵۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

آٹھویں جلد کا سالِ اشاعت ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) ہے۔ اس میں حدیث نمبر ۱۴۰۵۴ سے ۱۶۱۳۷ تک شامل ہے۔ اس میں کتاب البیوع، کتاب الشھادات، کتاب المکاتب اور کتاب الایمان والنذور ہے۔ اس کی ضخامت تفصیلات والفہرست (ص: ا سے ص: ۲۰) اور کتاب کا اصل متن (ص: ا سے ص: ۵۲۲) ملا کر کل ۵۴۲ صفحات ہے۔

نویں جلد کتاب الولاء، کتاب المواھب، کتاب الصدقہ، کتاب المدبر، کتاب الاسربہ اور کتاب العقول وغیرہ شامل ہے۔ یہ کل ۴۹۲ صفحات پر محتوی ہے۔ اس میں حدیث نمبر ۱۶۱۳۸ سے حدیث نمبر ۱۸۱۴۱ تک ملتی ہے۔

دسویں جلد ۴۸۴ صفحات کی ہے۔ اس میں کتاب العقول کا بقیہ حصہ، کتاب اللقطعہ، کتاب الفرائض، کتاب اھل لکتابین اور کتاب الجامع ہے۔ یہ ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) میں شائع ہوئی۔ اس میں حدیث نمبر ۱۸۱۴۲ سے حدیث نمبر

۱۹۷۳۰ تک ہے۔

اور گیارہویں جلد بھی اسی سال چھپی جس میں حدیث نمبر ۱۹۷۳۱ سے حدیث نمبر ۲۱۰۳۳ تک ہے۔ یہ پوری جلد کتاب الجامع پر مشتمل ہے۔ اس کی ضخامت ۵۲۰ صفحات ہے۔

اس طرح مولانا حبیب الرحمٰن نے ہزاروں صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب پر برسوں عرق ریزی اور محنت کرنے کے بعد اسے طباعت کے لائق بنایا۔ جوں ہی یہ کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئی اس کا پوری علمی دنیا میں پُر جوش خیر مقدم کیا گیا اور وہ عقیدت وشوق سے پڑھی گئی۔ علمِ حدیث کی ہر مقدس محفل میں اس کا تذکرہ عام ہو گیا اور مولانا کو اس کی اشاعت کے بعد اس قدر مقبولیت ملی کہ عالمِ اسلام میں ان کا نام انتہائی عظمت واحترام کے ساتھ لیا جانے لگا۔

المطالب العاليه بزوائد المسانيد الثمانيه:

حافظ ابن حجر عسقلانی (ف: ۸۵۲ھ) کی تالیف ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی تعلیق وتصحیح کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں دولتِ کویت کی وزارتِ اوقاف والشوؤن الاسلامیہ کے زیر اہتمام نہایت خوبصورت اور حسین طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ ماہنامہ برہان، دہلی کے ایڈیٹر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اصل کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”احادیث کی جمع و تدوین کا دور ختم ہوجانے کے بعد اکابر محدثین مختلف حیثیتوں سے احادیث کے مجموعے مرتب کرتے رہے جن میں سے بعض آج متداول ہیں اور اربابِ علم ونظر ان سے واقف ہیں۔ اسی زنجیر کی ایک کڑی یہ کتاب ہے۔ اس میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے ان احادیث کو ابواب

فقہ کے مطابق مرتب کیا ہے جو صحاحِ ستہ میں اور مسندِ احمد میں نہیں ہیں اوران آٹھ مسانید میں سے کسی میں موجود ہیں۔ ان مسانید کے نام یہ ہیں:

(۱) مسند طیالسی (۲) مسند حمیدی (۳) مسند ابن عمر (۴) مسند مسدد (۵) مسند ابن صنیع (۶) مسند ابن ابی شیبہ (۷) مسند عبد بن حمید (۸) مسند ابن ابی اسامہ

بعد میں حافظ ابن حجر نے مسند ابی یعلی اور مسند اسحٰق بن راہویہ کا ان پر اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب دس مسانید کا نچوڑ ہے۔ یہ مجموعہ تین وجوہ سے نہایت اہم اور قیمتی تھا۔

۱۔ اس کو حافظ ابن حجر جیسے حافظِ حدیث اور محقق و نقاد نے مرتب کیا تھا۔

۲۔ اس مجموعے کی احادیث ان مسانید سے ماخوذ تھیں لیکن جو اگرچہ مرتب کے زمانے میں موجود اوران کے پیشِ نظر تھیں لیکن اب ان میں سے اکثر و بیشتر ناپید ہیں اور ان سے استفادہ براہ راست ممکن نہیں ہے۔

۳۔ یہ احادیث صحاحِ ستہ اور مسندِ احمد کے احادیث و روایات کے علاوہ ہیں اور اس بنا پر متداول احکامِ فقہ پر ان سے نئی اور مزید روشنی پڑتی ہے۔'' (ماہنامہ برہان، دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء، ص: ۲۸۰)

مولانا حبیب الرحمٰن نے اس اہم کتاب کو دینی و علمی حلقوں سے متعارف کرانے کے لیے جو کدوکاوش اور محنت کی ہے اور اس کی تعلیق و تحقیق میں جس دلچسپی اور علمیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کہتے ہیں:

''اسی اہمیت کی بنا پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کو جنہیں نوادر اور مجموعہ ہائے احادیث کی کھوج رہتی ہے اس مخطوطہ کی تلاش و جستجو تھی۔ اس کا سعیدیہ لائبریری، حیدر آباد میں ایک مخطوطہ تھا مگر وہ ناقص تھا۔ مدینہ منورہ کی لائبریری میں اس کا سراغ لگا اور وہاں سے وہ مفقود تھا۔ آخر کار من جود وجد کے مطابق ترکی سے مولانا کو دو مخطوطوں کی فوٹو کاپیاں ملیں۔ ان میں ایک مجردہ تھی اور ایک مسندہ۔ یعنی ایک بغیر اسناد کے تھا اور دوسرا اسانید کے ساتھ۔ مگر دوسرا اغلاط اور تصحیفات سے پُر تھا۔ اس کے علاوہ اول تو اس کا خط باریک تھا اور پھر فوٹو بھی صاف نہیں آیا تھا۔ اس بنا پر اس سے کماحقہ، استفادہ سخت دشوار کام تھا۔ البتہ نسخہ مجردہ نسبتاً زیادہ صاف اور واضح تھا۔''

تعلیق و تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''مولانا نے مجردہ کو بنیاد بنایا اور اس کی تحقیق و ترتیب اور تعلیق و تحشیہ میں مصروف ہو گئے۔ اس سلسلے میں آپ نے جو اہم کام انجام دیے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ متن کی تصحیح اس طرح کی ہے کہ

(الف) جو لفظ نسخہ مجردہ میں غلط تھا مگر نسخہ مسندہ میں صحیح تھا اس کو متن میں جگہ دی ہے اور حاشیے میں اصل نسخہ کی نشاندہی کر دی ہے۔

(ب) جہاں دونوں نسخوں میں کوئی لفظ غلط یا بے معنی تھا، متن میں اس کی جگہ جو لفظ صحیح اور بامعنی ہو سکتا تھا وہ رکھا ہے اور اصلین میں جو غلط لفظ تھا اسے حاشیہ میں لکھ دیا

ہے۔اس صحیح لفظ کا انتخاب کبھی تو خود کیا ہے اور کبھی ان کتابوں کی مدد سے کیا ہے جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

(ج) کبھی یہ بھی کیا ہے کہ اصل نسخے میں جو لفظ تھا اس کو متن میں جوں کا توں رہنے دیا ہے لیکن حاشیے میں لکھ دیا ہے کہ خود آپ کی رائے میں وہ لفظ زیادہ قرین صواب تھا۔

۲۔ احادیث کے درجات متعین کیے ہیں۔ یہ نہایت اہم کام ہے۔اس کی قدر اہلِ فن ہی جان سکتے ہیں۔

۳۔ راویوں پر کلام کیا ہے۔

۴۔ جو الفاظ مغلق وغیرہ مشہور تھے ان کی لغوی تحقیق کی ہے۔

۵۔ اختلاف نسخ کا بالالتزام ذکر کیا ہے۔

یہ تعلیقات اس قدر کثرت سے ہیں کہ کوئی صفحہ ان سے خالی نہیں اور اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تاریخی، ادبی اور فنِ حدیث وعلم اسانید ورجال سے متعلق معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہے جس کے باعث کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔"

جیسا کہ ابتدا میں لکھا جاچکا ہے کہ یہ کتاب چار جلدوں میں کویت کی وزارت اوقاف کے زیر اہتمام انتہائی خوبصورت شائع ہوئی ہے۔اس کتاب کی چاروں جلدیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس کی پہلی جلد (الجزء الاول) ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں المطبعۃ العصریہ، کویت سے شائع ہوئی۔اس کے مشمولات حسب ذیل ہیں:

۵۔ المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیه ۱-۴۴۸

۶۔ الاستدراك والتصویب ۴۴۹-۴۵۲

۷۔ مراجع التحقیق ۴۵۳-۴۵۴

۸۔ فهرس المواضیع الرئیسیته الکتاب ۴۵۵-۴۵۶

۹۔ المحتوی (وهوفهرس الکتب والابواب التفصیلیه) ۴۵۷-۴۷۲

اس طرح یہ کتاب کل ۴۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں کتاب الطهاره، کتاب الغسل، کتاب الحیض، اکتاب الصلوٰة، کتاب النوافل، کتاب الجنائز، کتاب الزکاة، کتاب الصیام، اکتاب الحج، کتاب البیوع، کتاب عتق اورکتاب المواریث وغیرہ شامل ہیں۔اس میں کل ۱۴۹۱ حدیثیں ہیں۔

مولانا نے مقدمے میں حافظ ابن حجر کا مختصر لیکن جامع تعارف کرایا ہے اور کتاب کی افادیت واہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

دوسری جلد (الجزء ثانی) ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں المطبعه العصریه کویت سے شائع ہوئی۔ اس کے مشمولات ملاحظہ کیجئے:

۱۔ تقدیم الکتاب — وزیرالاوقاف والشوؤن الاسلامیه ۱-۲

۲۔ المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیه ۱-۴۵۰

۳۔ فهرس المواضیع الرئیسیه الهٰذا لجزء ۴۵۱

۴۔ المحتوی ۴۵۲-۴۶۴

یوں یہ جلد ۴۶۶ صفحات پر محتوی ہے۔اس میں حدیث نمبر ۱۴۹۲ سے حدیث نمبر ۲۷۰۰ تک ہے۔نیز کتاب النکاح الطلاق وتوابهما، کتاب الحدود، کتاب القصاس، کتاب الجهاد، کتاب الخلافه والاماره، کتاب القضاد الشهادات، کتاب اللباس والزینته، کتاب الاضحیه والعقیقه، کتاب

الصید، کتاب الاطعمه والاشربه، کتاب الطب، کتاب الادب، کتاب البر والصله وغیرہ شامل ہیں۔

تیسری جلد (الجزء الثالث) ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) میں المطبعة العصریہ، کویت سے چھپی۔ اس کی ترتیب اس طرح ہے:

۱۔ المطالب العالیه — الجزء الثالث	۱-۴۰۲
۲۔ الفهارس	۴۰۳
۳۔ المحتوی — الجزالثالث من المطالب العالیه	۴۰۱۴-۴۱۶

اس میں کتاب البر والصله کابقیه، کتاب تعبیر الرئویا، کتاب الایمان والتوحید، کتاب العلم، کتاب الرقائق والزهد، کتاب الاذکار والدعوات، کتاب فضائل القرآن، کتاب التفسیر وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں حدیث نمبر ۲۷۰۱ سے حدیث نمبر ۳۸۲۰ تک ہے۔

چوتھی جلد (الجزء الرابع) ۱۳۹۳ھ (۱۹۷۳ء) میں المطبعة العصریہ کویت سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کے محتویات یہ ہیں:

۱۔ ابتدائی صفحات	۱-۶
۲۔ المطالب العالیه۔ الجزء الرابع	۱-۴۱۲
۳۔ الاستدراك والتصویب	۴۱۳-۴۱۴
۴۔ المحتوی — الجزء الرابع	۴۱۵-۴۲۴

اس میں حدیث نمبر ۳۸۲۱ سے حدیث نمبر ۴۷۰۲ تک ہے۔ یہ حدیثیں کتاب المناقب، کتاب السیرة والمغازی، کتاب الفتن، کتاب الفتوح، بقیه کتاب الفتن اور کتاب البعث والحشر میں منقسم ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا یہ کارنامہ ان کے تبحرِ علمی اور دقتِ نظری کا شاہد ہے۔ یہ اربابِ ذوق کے لیے ایک روحانی تحفے کی حیثیت رکھتا ہے۔

الالبانی شذوذہ واخطاؤہ:

شیخ ناصرالدین البانی ایک زبردست سلفی عالمِ دین ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد ائمہ ومحدثین، سلفِ صالحین اور علمائے احناف پر زبردست تنقید کی جس کے باعث اکثر علمائے عرب ان سے مرعوب تھے۔ جب شیخ البانی سے مولانا حبیب الرحمٰن کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میری کتابیں پڑھ کر اپنی رائے تحریر کریں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی کتابوں کے ناشر زہیر شاویش کو اپنی تمام کتابیں مولانا کے وطن مئو بھجوادینے کا حکم بھی دے دیا۔

شیخ البانوی کی انھی کتابوں کے مطالعے کے نتیجے میں الالبانی شذوذہ واخطاؤہ منصۂ شہود پر آئی جو پہلے چار چھوٹے چھوٹے اجزا میں چھپی جس کے مجموعی صفحات ڈھائی سو ہیں۔ پھر ۱۹۸۵ء میں اسے کویت کے دارالعروبۃ للنشر والتوزیع نے اہتمام سے شائع کیا۔ اس کتاب کے چھپتے ہی دنیائے سلفیت میں بھونچال آگیا اور عالمِ اسلام کی علمی دنیا میں مولانا کی علمیت کا لوہا مانا گیا۔ اس کتاب میں مولانا نے شیخ البانی کی غلطیوں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کی تضاد بیانی کو اجاگر کیا۔ اس سے شیخ کی علمیت کے متعلق علمائے عرب کے خیالات کا طلسم یکایک ٹوٹ کر گر پڑا۔ کویت کی کتابوں کی ایک نمائش میں یہ کتاب بڑی تعداد میں فروخت ہوئی۔

فتح المغیث:

ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (ف:۸۰۶ھ) اپنے دور کے ایک نامی گرامی محدث گزرے ہیں۔ انھوں نے اصولِ حدیث کے موضوع پر ایک منظوم رسالہ الفیۃ الحدیث تصنیف فرمایا تھا جس کی منثور میں شرح مشہور ومعروف محدث حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (ف:۹۰۲ھ) نے فتح المغیث کے نام سے لکھی تھی جو تین ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کا مرتبہ علم اصولِ حدیث میں کافی

بلند ہے۔ یہ مصر و ہند سے شائع ہوئی لیکن کتابت وطباعت کی اس میں بے انتہا خامیاں تھیں۔ مولانا نے اس کے مطبوعہ نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے مطبعۃ الاعظمی، مئو (اعظم گڑھ) کے زیرِ اہتمام شائع کروایا۔

تلخیص خواتم جامع الاصول:

یہ علامہ طاہر پٹنی کی سعی وکوشش کا حاصل ہے۔ اس میں موصوف نے حدیث کی مشہور و مستند کتاب جامع الاصول کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب مخطوطے کی صورت میں بانکی پور، رام پور اور ندوۃ العلما کے کتب خانے میں محفوظ تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے اسے ان کتب خانوں سے حاصل کیا اور اس کو سائنٹفک طور پر ایڈٹ کر کے ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں مالیگاؤں سے شائع کروایا۔ اس کی طباعت کے اخراجات پٹن کے ایک علم دوست اور مخیّر تاجر عبدالغنی نورولی نے برداشت کیے۔

المصنف (ابن ابی شیبہ):

اس کتاب کا پورا نام الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار ہے اور اس کے مصنف کا پورا نام الامام الحافظ عبداللہ بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان ابوبکر بن ابی شیبہ الکوفی العبسی ہے۔ ابن ابی شیبہ کی وفات ۲۳۵ھ میں ہوئی۔ یہ کتاب بھی مصنف عبدالرزاق کی طرح کافی ضخیم اور عظیم المرتبت ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے اس کے قلمی نسخوں کا بھی سراغ لگایا اور اپنی زندگی کے اخیر ایام تک اس کی تحقیق وتعلیق میں مصروف ومنہمک رہے اور اس کی تقریباً پندرہ جلدیں ایڈٹ کیں۔ چار جلدیں حضرت مولانا کی زندگی میں ۱۴۰۳ھ (۱۹۸۳ء) میں المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ بقیہ جلدیں پریس میں تھیں کہ اس جلیل القدر محدث نے اس مادی دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

علمی وتحقیقی مقالات:

مولانا حبیب الرحمٰن نے وقتاً فوقتاً جو علمی وتحقیقی مقالات سپردِ قلم کئے ہیں وہ ملک کے موقر جرائد ورسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ اس قدر بیش قیمت ہیں کہ علمی وتحقیقی کام کرنے والے ان سے صرف نظر نہیں کرسکتے لہٰذا یہاں چند اہم مقالات کی فہرست درج کی جاتی ہے:

	مقالہ	اشاعت
۱۔	اسلام اور صنفِ نازک	ماہنامہ المومن، کلکتہ صفر تا جمادی الاول ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۳ء)
۲۔	حجیت حدیث	پندرہ روزہ القاسم امرتسر، ۱۱اپریل ۱۹۲۴ء
	ایضاً	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر، ۱۰مئی ۱۹۲۴ء
۳۔	حنفیہ کرام اور اتباعِ حدیث	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر ۱۰، ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء
۴۔	عدد رکعاتِ تراویح	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر ۲۵ مئی، ۱۰ جون ۱۹۲۴ء
۵۔	قادیانی مرتد کی سنگساری	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر، ۱۰نومبر ۱۹۲۴ء
۶۔	مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر ۲۵اپریل ۱۹۲۴ء
۷۔	واعتصمو بحبل اللہ	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر ۲۵اگست، ۱۰ستمبر ۱۹۲۴ء
۸۔	اخبار محمدی کے بعض مضامین پر ریویو	ہفت روزہ الفقیہہ امرتسر، ۲۸اپریل ۱۹۲۵ء
۹۔	ایڈیٹر اخبار محمدی کا شرانگیز مشغلہ	پندرہ روزہ القاسم، امرتسر ۳۱ جنوری، ۲۸ فروری ۱۹۲۵ء
۱۰۔	تذکرہ مشاہیر قوم	ماہنامہ المومن، کلکتہ شوال، ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء)

۱۱۔ علمائے اہلِ کمال	ماہنامہ المومن، کلکتہ، جمادی الاول و آخر، رجب ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء)
۱۲۔ معجزات و کرامات	ہفت روزہ الفیض، امرتسر ربیع الاول تا رجب ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء)
۱۳۔ احمدیوں کی ذلت و خواری پر محمدیوں کی بے قراری	ہفت روزہ العدل، گوجرانوالہ ۲۹ اپریل، ۷ امئی ۱۹۲۷ء
۱۴۔ مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت	پندرہ روزہ ارشاد، امرتسر، یکم مئی ۱۹۲۷ء
۱۵۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین	پندرہ روزہ ارشاد، امرتسر، یکم مئی ۱۹۲۷ء
۱۶۔ جواد سا باط	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۲۸ء
۱۷۔ عظمتِ صحابہ (خواجہ حسن نظامی کے باطل خیالات کی تردید)	ہفت روزہ العدل، گوجرانوالہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء
۱۸۔ حضرت معاویہ کی شان میں سوء ادبی اور اس کا جواب	ماہنامہ النجم، لکھنو جمادی الاول و آخر ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء)
۱۹۔ تحقیقاتِ مفیدہ	ماہنامہ الفرقان (سالنامہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء)
۲۰۔ دو متبرک اجازت نامے	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۳۷ء
۲۱۔ مسئلہ اطاعتِ امیر (اسوۂ حسین کی روشنی میں)	پندرہ روزہ ضیاء الاسلام، امرتسر ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء
۲۲۔ مسئلہ تفویض اور ایک وکیل کا دخل درمعقولات	پندرہ روزہ ضیاء الاسلام، امرتسر ۱۹۳۹ء (چھ قسطوں میں)
۲۳۔ تخریجِ زیلعی	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۴۰ء
ایضاً	ماہنامہ الفرقان، اگست ۱۹۴۰ء
۲۴۔ رجال بخاری کا دنداں شکن جواب	ماہنامہ الداعی، لکھنو، اگست، ستمبر ۱۹۴۱ء

۲۵۔ محدثین پر سلطنت کی ہوا خواہی کا الزام	ماہنامہ دارالعلوم، دیو بند جنوری، فروری ۱۹۴۲ء
۲۶۔ موضوعات القصاص	ماہنامہ دارالعلوم، دیو بند، مارچ ۱۹۴۲ء
۲۷۔ الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ کا نادر نسخہ	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ اگست ۱۹۵۰ء
۲۸۔ تبصرہ بر تصحیح الاغلاط الکتابیۃ	ماہنامہ الفرقان، اپریل ۱۹۵۲ء
۲۹۔ مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۵۴ء
۳۰۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	ماہنامہ برہان، دہلی، مارچ، اپریل، ۱۹۵۴ء
۳۱۔ قرون اولیٰ میں حفظِ حدیث کا اہتمام	ماہنامہ البلاغ، جون ۱۹۵۴ء
۳۲۔ ہندوستان میں علومِ حدیث کی تالیفات	ماہنامہ برہان، دہلی، فروری ۱۹۵۴ء
۳۳۔ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء
۳۴۔ تصحیح واستدراک (پورب کی ......)	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۵۵ء
۳۵۔ تبصرہ بر زجاجۃ المصابیح	ماہنامہ الفرقان، جولائی ۱۹۵۷ء
۳۶۔ سیف وقلم	ماہنامہ دارالعلوم، دیو بند، اپریل ۱۹۵۷ء
۳۷۔ قرون اولیٰ میں علمِ حدیث کا اہتمام	ماہنامہ دارالعلوم، دیو بند، مارچ ۱۹۵۹ء
۳۸۔ الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۶۱ء
۳۹۔ قاضی رشید بن زبیر غسانی	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جون ۱۹۶۱ء
۴۰۔ دینور اور مشائخِ دینور	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۵ء
۴۱۔ فتوحاتِ حضرت معاویہ (تاریخ کی روشنی میں)	ماہنامہ دارالعلوم، دیو بند، اپریل ۱۹۶۵ء
۴۲۔ ابو عبیدہ کی غریب الحدیث	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۷ء

۴۳۔ غریب الحدیث	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۶۸ء
۴۴۔ مسلم پرسنل لا یا اسلامی شریعت	ماہنامہ البلاغ، بمبئی، مئی ۱۹۷۲ء
۴۵۔ قافلۂ اہلِ دل	ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۴ء
۴۶۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی اور ان کا سفرِ حج	ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء
۴۷۔ فہرست مخطوطات عربیہ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ اپریل ۱۹۷۹ء
۴۸۔ ابراہیم بن ادہم	ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۹ء
۴۹۔ مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع یا جامع معمر	ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ جون و جولائی ۱۹۸۳ء

شاعری

حیات ابوالمآثر کے مصنف ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے اپنی کتاب میں مولانا حبیب الرحمٰن کی شاعری کے جو نمونے ماہ وسال کے حوالے سے دیے ہیں ان کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ انھیں شاعری کا شوق بہت کم عمری میں، طالب علمی کے زمانے میں ہوا اور انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو شعر کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ دستیاب کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصنافِ سخن میں نعت، غزل، مرثیہ اور قطعۂ تاریخ ان کی فکر کے محور تھے۔ ان کی نعتیں عشقِ رسولؐ سے آراستہ ہیں۔ غزلوں میں نوجوانی کی امنگیں اور خواہشات اپنے پورے شباب پر ہیں۔ انھوں نے مرثیے اور قطعاتِ تواریخ، مشاہیر علما کی موت سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔ وہ شاعری کے فن اور اس کے محاسن ومعائب سے پوری طرح باخبر تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال سے متاثر ہو کر چند اشعار پر مشتمل جو نظم لکھی تھی اسے روزنامہ انقلاب، بمبئی میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ اس نظم کے بعض اشعار کو خارج از بحر سمجھ کر قاضی اطہر مبارکپوری نے ان میں تبدیلی کر دی۔ موصوف اس وقت انقلاب کی مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔ اس تبدیلی کو دیکھ کر مولانا حبیب الرحمٰن نے قاضی صاحب کو جو خط تحریر کیا وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ

موصوف شاعری کے فن پر بہت ہی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''آپ کے تصرفات کی نسبت گزارش ہے کہ اصلاح اگر موجہ ہو تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گزار بھی ہوتا ہوں۔ مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی۔ میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر ''بحر رمل مسدس محذوف'' میں خیال کیا، اس لیے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے آپ نے اس وزن پر بنا ڈالے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ میری نظم قران السعدین، مخزن اسرار، مطلع الانوار، اور سبحۃ الابرار کے وزن پر ''بحر سریع مطوی موقوف'' سے ہے جس کا عروض وضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف (فاعلان) ہو سکتا ہے۔ اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے۔ اس کے بعض شعر یا مصرعے۔ بحر رمل میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ جیسے مولانا جامی کے یہ اشعار:

زفتنِ او جستنِ تیر از کماں | جستنِ او جحتِ طےِ مکاں
توبہ دہ از سرکشی ایام را | باز خر از ما خوشی اسلام را
دیدۂ عالم بتو روشن شود | گلخن گیتی بتو گلشن شود
ظلمتِ بدعت ہمہ عالم گرفت | بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

مصرع اولیٰ بحر رمل میں بھی پڑھا جا سکتا ہے:

چوں نہ بزرگست و شرعش سخن | منبر او برسر او خورد کن

اس میں صرف مصرعۂ ثانیہ بحر رمل میں پڑھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ سبحۃ الابرار جامی بحر سریع میں ہے اور اس کا پہلا مصرعہ:

ہست صلائے برِ خوانِ کریم

ہے اوراسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے:

اے مبرا پردۂ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب"

مولانا نے اسی خط میں مباحثہ کے بعد قاضی اطہر کی ایک عربی نظم میں کچھ اصلاحات فرمائی ہیں۔قاضی صاحب نے مولانا کی فنِ شاعری کے متعلق اس تنقید کوقدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا اوراسے "ایک علمی اورادبی مکتوب گرامی ......بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح" کے عنوان سے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کے انقلاب (بمبئی) میں شائع بھی کیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن نے اردو، فارسی اور عربی، ان تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے ابتدا میں اختر اور پھر شوق تخلص اختیار کیا۔بعض کلام میں حبیب تخلص بھی ملتا ہے۔ہم یہاں ان کے اردو کلام کے چند نمونے درج کرتے ہیں تاکہ ادبی ذوق رکھنے والے ان سے لطف حاصل کرسکیں۔

نعت النبی ﷺ

(۱)

نعت میں رطب اللساں ہے احمد مختار کی — دھوم ہو کیونکر نہ میرے خامۂ دُربار کی
ہو غلامی کا مجھے تمغہ عطا روحی فداک — عزت افزائی ہو اتنی شاعر دربار کی
کھاتی تھی موجِ ضلالت کے تھپیڑے دمبدم — آپ نے آکر سنبھالا اور کشتی پار کی
جس نے دیکھا ہو گیا وہ کشتۂ تیغِ ادا — کیا ضرورت آپ کو خنجر کی اور تلوار کی

اک نگاہِ لطف سے دیکھا جہاں سرکار نے
بھر گئی جیبِ مراد اس اخترِ نادار کی

(۲)

مرے ماں باپ مری جان رسولِ عربی — ترے صدقہ ترے قربان رسولِ عربی
ہر ادا پہ تری اور سنتِ بیضاپہ تری — میں دل وجاں سے ہوں قربان رسولِ عربی
آرزوئے دلِ بیتاب ہے مدت سے یہی — بنوں میں آپ کا مہمان رسولِ عربی
صرف اک تیری غلامی و محبت کے سوا — مغفرت کا نہیں سامان رسولِ عربی
مدعا ہے کہ رہے آپ کا ذکرِ محمود — وردِ ہر لحظہ و ہر آن رسولِ عربی

شوقؔ پر اک نظرِ لطف و کرم ہو شاہا!
آپ کا ہے یہ ثنا خوان رسولِ عربی

(۳)

وہ جہاں کا رمزِ وجود ہے، وہ مدارِ کارِ نظام ہے
وہ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہرِ تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتحِ مکہ کا واقعہ
وہ خدا کا قہر و جلال تھا، یہ نبی کی رحمتِ عام ہے
سبھی انبیائے کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
وہ ہلالِ چرخِ کمال تھے، مرا شاہ بدرِ تمام ہے
جو غذائے روح و سکون دل ہے انھیں کی پاک حدیث ہے
جو مریضِ دل کے لئے شفا ہے انھیں کا پاک کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہِ لطف و کرم سے ہے
قلم و زبانِ حبیبؔ کیا ہے انھیں کا فیض دوام ہے

(۴)

میں والہ و شیدا ہوں نبیِ عربیؐ کا
مکی، مدنی، ہاشمی و مطّلبی کا
ایماں ہے مرا زمزمہ خواں صدر خلافت
صدیقؓ، عمرؓ، حضرتِ عثمانؓ و علی کا
ہیں بیت کا مصداق نساء اقدم و اول
اور ثانوی ہے اہلِ عبائے نبوی کا
جو آنکھیں تھیں انوارِ نبوت سے منور
خاکِ کفِ پا ہوں میں ہر اک شیخ و صبی کا
بیروت و کویت اور حلب میں نہ کشش تھی
یہ جاذبہ تھا حُبِّ حدیث نبوی کا
ہے خلقِ نبیؐ خاصۂ ختمِ رسالت
دنیا میں علم لے کے اٹھو خلقِ نبی کا

کتنی اثر انگیز تھی ہجرت کی وہ تاریخ
بس تین ہی فقرے کا تھا یہ خطبہ نبیؐ کا

تھے ابنِ سلامؓ اک بڑے ذی علم یہودی
موجب ہوا اسلام کا یہ خطبہ نبیؐ کا

آمد کی صدا کانوں میں اک نخل پہ آئی
بے خوف و خطر کو دے سنا کلمہ نبیؐ کا

کھلواؤ مساکین کو پھیلاؤ سلام آپ
اٹھ جاؤ کہ جب غلبہ ہو خوابِ سحری کا

چہرے پہ نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولے
ممکن نہیں یہ چہرہ ہو کذّاب شقی کا

اس انس و تعلق کی بنا پر ہوں پُر امید
دیوانہ ہوں مدت سے حدیثِ نبوی کا

غزلیات

(۱)

کسی کا چہرۂ تاباں ہے مطلعِ انوار
ہے بڑھ کے چرخِ چہارم سے آستانۂ یار

کچھ ایسی چھیڑ رہی مجھ سے چرخِ ظالم کو
کہ باغ حسن کی اک پل نہ دیکھنے دی بہار

ہوا اثر ہے یہ جادوئے چشمِ فتاں کا
رہے نہ قابو میں ہوش و حواس و صبر و قرار

کسی کی زلف کی پھیلی ہوئی ہے یہ خوشبو
کہ ہوگیا ہے بنارس بھی خطۂ تاتار

جو بت کہ ہو ادب آموز ہندو کالج میں
بھلا وہ جامِ شرارت سے کیوں نہ ہو سرشار

جو وہ ہے شوخی میں یکتائے روزگار اخترؔ
تو اس سے شوخی میں کچھ کم نہیں مرے اشعار

(۲)

کیسی اس نام میں واللہ درخشانی ہے
روشن اس سے ہی مسمیٰ کی بھی ذیشانی ہے

لوگ تو کہتے ہیں وہ ثانیِ کنعانی ہے
پر میں کہتا ہوں کہ وہ یوسفِ لاثانی ہے

آپ کے گیسوئے شبگوں کا ہے سودا وہ شے
جس کے ہاتھوں ہوئی اک خلق ہی دیوانی ہے

آب کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے
معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہیں پانی ہے

دیکھ کر تابشِ دندانِ صفا خیز تری
غرقِ دریائے خجالت دُرِ عمانی ہے

قدرداں بول اٹھے سن کے کلامِ اخترؔ
کوئی اعجاز ہے یا طرزِ سخن دانی ہے

(۳)

نہ دو رقیب کو بوسہ مجھے دکھا کر کے
ملے گا کیا کسی بے کس کا جی کڑھا کر کے

کئے کی اپنے سزا پائی دل لگا کر کے
جنوں نے مجھ کو پھرایا برہنہ پا کر کے

اڑائے اپنے گریباں کی دھجیاں گل بھی
جو نکلو سیر کو زیبِ بدن قبا کر کے

کلیجہ بلبلِ شیدا کا پھٹ پڑے نہ کہیں
چمن میں آؤ نہ بندِ قبا کو وا کر کے

گلے میں ڈال دیں باہیں جو شوق میں آکر
تو بولے دیکھنا صاحب ذرا بچا کر کے

مرید پیر مغاں خود بھی ہو گئے جا کر
گئے تھے شیخ جی کیا کرنے، آئے کیا کر کے

(۴)

بزمِ طرب میں یکسو چھڑا تارِ ساز تھا
شمعوں پہ ایک عالمِ سوز و گداز تھا

موجوں کی زد سے ماہِ عرب نے ہٹا لیا
جب معرضِ خطر میں ہمارا جہاز تھا

ہم کو بھی اک زمانے میں اے شیخِ معتکف!
مسجد سے انس دل میں فراق نماز تھا

حوریں بھی سیرِ عالمِ بالا میں دیکھ لیں
نہ یہ ادا، نہ غمزہ، نہ عشوہ، نہ ناز تھا

ہم کیا دکھائیں جودت طبع رسا کی حیف
اب وہ دماغ ہی نہ رہا جس پہ ناز تھا

بہر جنازہ ٹوٹ پڑے ہیں ملائکہ
اخترؔ بھی کوئی متقیِ پاکباز تھا

(۵)

راز دل کا نہیں رہ سکتا ہے پنہاں کوئی
رہے ہر وقت جب انگشت بدنداں کوئی

زلف کافر کے تطاول کا یہی حال ہے جب
کہیں ڈھونڈھے سے ملے گا نہ مسلماں کوئی

میں نے مانا کہ تو مردوں کو جلاتا ہے مسیح
ہے ترے پاس مرے درد کا درماں کوئی

حسن کو ان کے مرے عشق نے چمکایا ہے　　بھولے ہرگز نہ مرے عشق کا احساں کوئی

قیسِ عامر ہو کہ فرہاد ہو یا اور کوئی
نہیں اخترؔ کی طرح سوختہ ساماں کوئی

(۶)

ملتا جو نہیں تم سا حسیں یار ہمیشہ　　ملتے بھی نہیں ہم سے وفادار ہمیشہ

کرتا ہوں جو دندانِ صفا خیز کی تعریف　　رہتا ہے قلم میرا گہر بار ہمیشہ

اے دل! نہ کہا تھا نہ اٹھانا غمِ الفت　　آرام میں رہتے ہیں سبکسار ہمیشہ

دنیا میں ملال اور خوشی دونوں ہیں توام　　ہے باغ میں ہم پہلوئے گُل، خار ہمیشہ

واعظ نے کہا پی کے جب آیا وہ مزے میں　　آباد رہے خانۂ خمّار ہمیشہ

کہتا ہوں کہ کب تک یہ ستم ڈھاؤ گے صاحب
کہتا ہے خفا ہو کے جفا کار ہمیشہ

(۷)

بچائے حق ترے تیرِ نظر سے　　کہ دل کو توڑ کر گذرا جگر سے

بچائے دل بتِ جادو نظر سے　　ہے باہر حدِّ امکانِ بشر سے

نہ کیوں خالی ہو آہ اپنی اثر سے　　شروعِ عشق ہے ماہِ صفر سے

جگا دے مے کے چھینٹوں سے کہ ساقی　　صبوحی کش پڑے ہیں بے خبر سے

اگر ساقی اٹھائے آنکھ مستو!　　شرابِ ناب بھی گردوں سے برسے

نہیں معلوم کیا گذری الٰہی　　ابھی لوٹا نہیں قاصد ادھر سے

یہاں رہتے ہو کیوں کر قبر والو!　　نہیں ہوتی ہے وحشت اس کھنڈر سے

درِ میخانہ پر اے حضرتِ شیخ!　　بتائیں آپ آتے ہیں کدھر سے

جمالِ یار دیکھا تم نے موسیٰ　　پڑے ہو جلوہ گہ میں بے خبر سے

نسیمِ صبح تنکے چن رہی ہے　　کوئی آنے کو ہے اس رہ گذر سے

قضا کی تیغ ہے تیغِ ادا بھی نہیں رکتا ہے وار اس کا سپر سے
خلش نوکِ مژہ کی ہے قیامت بہت بے چین ہوں دردِ جگر سے
قیامت ہے رہیں ہم سے کشیدہ رقیبوں سے ملیں شیر و شکر سے
نمونہ حشر کا مقتل ہے اے تُرک صدائے الامان و الحذر سے
ہوئی شامِ جوانی زلف لیکن گیا اس زلف کا سودا نہ سر سے
دُرِ مضموں پروئے تو نے اختر
ترے اشعار ہیں سلکِ گہر سے

(۸)

مجھے وحشت ہوئی دیوار و در سے گیا صحرا کو میں دیوانہ گھر سے
نکل آیا ہے طفلِ اشک گھر سے نہیں واقف ہے تکلیفِ سفر سے
میں صحرا میں ہوں گھر پر میری حسرت لپٹ کر روتی ہے دیوار و در سے
مری وحشت یہی کہتی ہے مجھ سے کہ جا کر توڑ سر اس سنگ در سے
چمن میں دامنِ گل پارہ پارہ وہاں پہلے ہی مرغِ نامہ بر سے
ہے نخلِ بارور نخلِ قدِ یار نہ دو تشبیہ سروِ بے ثمر سے
بتوں کے رخ پہ آب و تاب ہے کیا یہ منھ دھوتے ہیں کیا آبِ گہر سے
گئی ہیں آتشیں آہیں فلک پر نہ کیوں پانی کے بدلے آگ برسے
فرنگن کافروں کی زلف گویا ید قدرت نے دھوئی آبِ زر سے
صدائے مرغ سن کر وصل کی شب جگر میں ٹیس اٹھی پچھلے پہر سے
وہ سن کر ہوگئے بیتاب اے دل! نہیں خالی ترے نالے اثر سے
حباب آسا ہیں بحرِ عشق میں ہم خدا ہی ہے جو بچ جائیں بھنور سے
ہیں اس میں کشتۂ نازِ بتاں دفن یہ ظاہر ہے مری لوحِ حجر سے
جمال و حسن میں اختر وہ عارض

کہیں بڑھ کر ہیں خورشید و قمر سے

(۹)

باقی نہیں نشاں بھی مرے جسمِ زار کا
کیا خاک مجھ کو ڈر ہو لحد کے فشار کا

روشن ہے ایک داغ دلِ داغدار کا
جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا

اب آسمان ٹوٹے گا کس پر کہ اے بتو!
باقی نہیں نشان ہمارے مزار کا

اتنی کڑی تھی ہوگئی مدت پئے ہوئے
ساقی ہے آج تک وہی عالم خمار کا

کالی بلا کوئی کہ شبِ غم ہے اے خدا!
یا ماتمی لباس کسی سوگوار کا

آتی ہے بو شراب کی خاکِ مزار سے
بیشک مزار ہے یہ کسی مے گسار کا

یوں بھیڑ عاشقوں کی ہے در پر ترے صنم
میلا لگا ہو جیسے کوئی ہردوار کا

ششدر ہوئے ہیں آ کے نکیرین قبر میں
ملتا نہیں نشان مرے جسمِ زار کا

اختر گنا کیا ہوں میں تاروں کو صبح تک
اچھا یہ مشغلہ تھا شبِ انتظار کا

(۱۰)

لا ادھر ساقی یہ کیوں رکھی ہے پیمانوں میں
چھا گیا ابر، بہار آئی گلستانوں میں

اس قدر جوشِ جنوں ہے ترے دیوانوں میں
گھر میں اک پاؤں ہے، اک پاؤں بیابانوں میں

ہے مرے قصۂ پُر درد میں جو سوز و گداز
وہ نہیں کوہ کن و قیس کے افسانوں میں

رنج و غم میں نہیں اب کوئی کسی کا پرساں
نام کو بھی نہیں انسانیت انسانوں میں

پاسدار اُن کا ہے دل کہنے کو ہے پاس مرے
سمجھوں اپنوں میں کہ سمجھوں اسے بیگانوں میں

محو ہیں لذتِ آزار میں آزار پسند
وہ نہیں جانتے کیا لطف ہے احسانوں میں

کیا ترا وحشیوں نے چاک گریباں دیکھا
ایک دھجی نہیں اب ان کے گریبانوں میں

ہوں وہ محرومِ ازل سوختہ اختر یارب
شمعیں داغوں کی جلاتا ہوں شبستانوں میں

کیا مئے تند ہے میخانۂ مینائی کی

میں ہوں اخترؔ اسی خمخانے کے مستانوں میں

(۱۱)

مدتوں سے نہیں دیکھا رخِ زیبا تیرا ، مگر آنکھوں کے تلے پھرتا ہے نقشہ تیرا
گرچہ دنیا میں حسینوں کی ہے تعداد بہت ، مگر ان سب میں مجھے حسن ہے بھایا تیرا
چاہیے کچھ رحم مرے حال پہ کھایا کہ سنا
اخترِ زار کو تو ہو چکا سودا تیرا

(۱۲)

انتہا ہوگئی تغافل کی ، مر گئے ہم تجھے خبر نہ ہوئی
ہے تو لیکن نظر نہیں آتی ، یہ معما ہوئی کمر نہ ہوئی
اب لگے دیکھنے بچا کے نظر ، نہ ہوئی آہ بے اثر نہ ہوئی
متحمل تمہارے جلووں کی
نہ ہوئی اُف مری نظر نہ ہوئی

(۱۳)

میں قائل ہوں تعشق کے مزہ کا ، پر اس میں سامنا بھی ہے قضا کا
شب وعدہ تھی لیکن وہ نہ آئے ، بہانہ مل گیا ان کو حنا کا
اڑا لے جاتی گر مجھ کو وہاں تک ، بہت احسان تھا بادِ صبا کا
جو آئے ہو تو کچھ منہ سے تو بولو ، ہے کیا یہ بھی کوئی موقعہ حیا کا
خدا حافظ ہے اس ظلمت کدہ میں ، گدائے کوچۂ زلفِ دوتا کا
وہ بالی عمر، وہ بھولی سی صورت ، غضب اس پر کھلی رہنا قبا کا
مری باتوں پہ اب آنے لگے وہ ، اثر شاید ہوا آہ و بکا کا
بتوں کا عشق اوروں کو مبارک ، ''یہ دل شیدا ہے محبوب خدا کا''
وہ بیٹھے رہ گئے مہندی لگا کر ، نکالا خوب حیلہ دست و پا کا

مصور نے ہزاروں کوششیں کیں — نہ نقشہ کھنچ سکا ناز و ادا کا
وہ بجلی کے تڑپنے کی گھڑی تھی — کہ عالم خندۂ دنداں نما کا

ہوئے اشعار کیا پر نور اخترؔ
پڑا تجھ پر بھی کیا پرتو ضیا کا

(۱۴)

نہ بھولی ہے نہ کبھی دل سے آہ بھولے گی — ادا کسی کے دبے پاؤں چپکے آنے کی
بجھی نہ گرمیِ شوق ان کی سرد مہری سے — ہزار کوششیں گو اس نے کیں بجھانے کی
صبا کی چھیڑ پہ جھلا کے بول اٹھا غنچہ — یہ بار بار بُری لت ہے گدگدانے کی
سمجھ سکے گا وہی میرے دل کی حسرت کو — جو تکتا رہتا ہو راہیں قضا کے آنے کی
ہے عشق بھی کوئی کمبخت لاعلاج مرض — اثر دعا نے، نہ تاثیر کچھ دوانے کی

کہاں میں اور کہاں دیوبند اے اخترؔ
کشش نے کھینچ کے پہنچایا آب ودانے کی

(۱۵)

نہ ہوتا غیر، ہم، تم اور چمن کی گلز میں ہوتی — گھٹا چھائی ہوئی حاضر شرابِ آتشیں ہوتی
کسی مسجد میں ہم بھی بیٹھ کر ذکر خدا کرتے — جو تیری بات زاہد درخور صدق ویقیں ہوتی
تپ غم میں ترے بیمار کو ہے تشنگی ازبس — پئے جاتا ہے خونِ دل مگر سیری نہیں ہوتی
مسیحا گر علاجِ دردِ دل کرنا ہے کر دیکھو — مگر تدبیر اس میں کارگر کوئی نہیں ہوتی
جو آجاتا بتِ عیار میرے دم دلاسے میں — تو پھر ساری خدائی اپنی ہی زیرِ نگیں ہوتی

اگر گلشن میں ہوتا جاکے میں نکتہ سرا اخترؔ
گلِ سوسن سے پیدا اک صدائے آفریں ہوتی

(۱۶)

جانبِ قتل گہِ ناز اگر جاتے ہیں — تیرے جانباز لئے ہاتھ میں سر جاتے ہیں

آتے ہی محفلِ عشرت سے نہ اٹھوا ہم کو
دیکھ لینے دے ہمیں ایک نظر جاتے ہیں

ہوش اڑا دیتے ہیں عشاق کے اے رشکِ پری
ترے گیسو جو کبھی رخ پہ بکھر جاتے ہیں

دیکھئے مدرسۂ عشق کا اعجاز اے شیخ!
جتنے بگڑے ہوئے آتے ہیں سنور جاتے ہیں

بے کئے وعدے وفا کرتے ہیں اکثر اے دل
بارہا کر کے وہ اقرار مکر جاتے ہیں

دل سے جاتے ہوئے کہتا ہے خیالِ جاناں
تجھ کو اے دردِ مبارک ہو یہ گھر جاتے ہیں

دیر کا قصد تھا وحشت میں چلے سوئے حرم
ہم کو جانا تھا کدھر اور کدھر جاتے ہیں

شیخ کعبہ کو چلے جب تو کسی نے پھبتی
یہ کہی خوب کہ اللہ کے گھر جاتے ہیں

یہ ادا دیکھ کے کیونکر نہ کوئی مر جائے
لاش پر غیر کی کھولے ہوئے سر جاتے ہیں

آپ قائل ہی نہ تھے تیرِ نظر کے اے شیخ!
ہاتھ سے تھامے ہوئے آپ جگر جاتے ہیں

کون آتا ہے تری آنکھ کا شیدا اے شوخ!
پیشوائی کے لئے تیرِ نظر جاتے ہیں

ساتھ ہو لیتی ہے بادِ سحری اے اختؔر
ٹھنڈے ٹھنڈے وہ مرے گھر سے اگر جاتے ہیں

مسلمانوں سے خطاب

ارے او ننگِ ہستی تجھ پہ یہ خوابِ گراں کب تک
نگاہِ صاعقاں کی زد میں تیرا آشیاں کب تک
نشاں ہشیاریوں کے تجھ میں پائے کیوں نہیں جاتے
رہیں گی باعثِ تخریب تیری سستیاں کب تک
پسند اتنا کیا ہے کس لئے قعرِ مذلت کو
رہے گا اس طرح گم کردہٗ نام ونشاں کب تک
ترے ہر کام کو کیوں اختلاف اتنا ہے کوشش سے
بھلا یہ تیری جدوجہد سے ناچاقیاں کب تک
تری راہِ عمل سے دوری و بیگانگی کتنی
ترقی کی تگ و دو میں پسِ ہر کارواں کب تک
جمود اتنا تری ہستی میں برف آسا بھلا کیوں ہے
جمود آمیز بالآخر تری سرگرمیاں کب تک
کرے گا عقل کو رہبر نہ کب تک اپنے کاموں میں
رہے گا طفلِ مکتب بن کے وقفِ این وآں کب تک

نہیں ہوتی تجھے کیوں فکر اپنے آشیانے کی
ترقی کے نئے گلشن میں تو بے خانماں کب تک
ترے اس ضعفِ قومیت کی آخر کوئی حد بھی ہے
رقیبوں کی نظر میں تو پسِ ہر کارواں کب تک
بھلا علم و عمل سے مشورہ تو کیوں نہیں کرتا
جہالت کو بنا رکھے گا اپنا رازداں کب تک
کہاں تک تجھ کو نفرت درس گاہِ علم و حکمت سے
کرے گا ہوٹلوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کب تک
سمجھ رکھا ہے تو نے تھیٹروں کو وعظ کی محفل
تجھے دھوکے میں رکھیں گی تری کج فہمیاں کب تک
ذرا بیدار ہوجا اب بھی وقتِ کار باقی ہے
علاجِ درد کچھ کر، تن میں جانِ زار باقی ہے

مراثی

﴿ ۱ ﴾

بروفات مولانا قادر بخش سہسرامی

کیسی حسرت برس رہی ہے آج　　　کبھی عالم کا یہ نہ تھا آئیں

جس کو دیکھو ہے آج خاک بسر　　　جس کو سینے وہ آج ہے غمگیں

اس چمن کے ہیں غنچے مرجھائے　　　جس سے آتی تھی بوئے عطر آگیں

ہائے اب نغمۂ طرب انگیز　　　بلبلِ خستہ کی زباں پہ نہیں

رنگ پھیکا پڑا ہے ہر اک کا　　　خالِ مشکیں ہو یا لبِ لعلیں

چھوڑ دی ہے عروسِ دہر نے بھی　　　اسی ماتم میں آج کل تزئیں

حافظ و حاج ، عالمِ کامل　　　مرشد و مقتدائے اہلِ زمیں

فاضلِ بے مثال قادر بخش　　　چل دئے آہ سوئے خلدِ بریں

ایسے لوگوں کا ہائے اٹھ جانا　　　وقف جو ہوں پئے حمایتِ دیں

ایسے ارکان منہدم ہو جائیں　　　، پھر بھی محکم رہے اساسِ دیں

وہ قیامت بپا کی رحلت نے　　　ہل گیا سارا عالمِ زیریں

سنتے ہی یہ جگر شگاف خبر　　　بن گیا ہوں میں پیکرِ غمگیں

با دلِ زار و باسرِ حسرت | بول اٹھے گل ہوا چراغِ دیں
اب یہی ہے دعائے اخترِ زار | ربنا الغفرلہٗ ولی آمیں

﴿ ۲ ﴾

بروفات مولانا عبدالغفار عراقی مئویؒ

شیخ و استاذ مرے مولوی عبدالغفار | ناشرِ علمِ نبی، ماحیِ شرک و بدعت
ان کا ہر فعل تھا نقشِ قدمِ فعلِ سلف | ان کا ہر قول مؤید بکتاب و سنت
ہمہ دم مشغلۂ سیرِ کتب میں مصروف | درس و تصنیف میں تھی آٹھ پہر محویت
وسعتِ علم سے ان کی علما تھے حیراں | جودتِ ذہن و ذکا سے فضلا کو حیرت
ادبا کے تھے وہ سرتاج، محدث بھی فقیہ | ناظم و ناثر و ہم شاعرِ عالی ہمت
آہ وہ ذات کہ مجموعۂ اوصاف تھی وہ! | آہ وہ دبدبۂ علم، وہ شان و شوکت!
آہ وہ نکتہ رسِ فقہ، وہ علّامۂ دہر! | آہ وہ ناقدِ اخبارِ نبیِ رحمت!
آہ وہ واقفِ اسرار و رموزِ قرآں! | آہ وہ جامعِ انواعِ فنونِ حکمت!
ان کی ہی ذات تھی سے رونقِ بازارِ علوم | ان کے ہی دم سے گروہِ علماء کو عزت
جامعیت ہمہ گیری تھی انھیں پر بس ختم | حجۃ اللہ تھے وہ اور حکیم الامت
آہ کس منھ سے کہوں آج کہ خامۂ بدہن | ان فضائل کا وہ مجموعہ ہے زیرِ تربت

فکر تھی از پئے تاریخِ وفات اختر کو
غیب سے آئی ندا ان پہ خدا کی رحمت

۱ ۳ ۴ ۱ھ

قطعۂ تاریخ وفات
علامہ سید سلیمان ندویؒ

فاضل و علامہ سلیمان آج ہوگئے افسوس کہ ہم سے جدا
آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں فاضل و علامہ سلیمان سا
ماہر تاریخ و حدیث و سیر واقفِ اسرارِ کتابِ خدا
اردو تو اردو عربیت میں بھی ان کو بہت دخل، بڑا درک تھا
کیا نظر آتا ہے کہیں وہ کمال ان کو جو انشا و کتابت میں تھا
حیف یہ گنجینۂ علم و ادب دفن تہہِ خاکِ کراچی ہوا

فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں
دل نے کہا، فاضلِ یکتا گیا
۱۳۷۳ء

مشاہیر کی نظر میں

مولانا حبیب الرحمٰن کی پُر خلوص شخصیت اس قدر سادہ و معصوم تھی اور ان کے علمی و تحقیقی کارنامے اس قدر وقیع اور جامع تھے کہ وہ لوگوں کی توجہ کو ہمیشہ اپنی جانب کھینچتے رہے۔ ان کے کارناموں کی تعریف سبھی نے کی اور انھیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ یہاں ہم ان کی شخصیت اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کے متعلق چند مشاہیر کے خیالات قلمبند کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کہتے ہیں:

> ''ہندوستان کے خادمانِ حدیث اور ماہرینِ علمِ حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو، ضلع اعظم گڑھ) کا ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی۔'' (صدق جدید لکھنؤ، شمارہ ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص: ۴)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ان کی علمی خدمات کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

> ''الشیخ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علما میں سے ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں ''غریب شہر'' ہیں لیکن عرب ممالک

میں ان کے علم وفضل اور شہرت وعظمت کا طوطی بولتا ہے اور اس
شہرت وعظمت کی بنیاد حدیث کی وہ نادر اور اہم کتابیں ہیں جن
کے مخطوطے کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے
مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔" (ماہنامہ برہان، دہلی،
اپریل ۱۹۷۴ء، ص:۲۸۷)

مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

"آپ نے چٹائیوں پر بیٹھ کر تنہا وہ کام انجام دیا جس کو بڑے
بڑے علمی ادارے اور اکیڈمیاں بھی نہیں کر سکیں اور وہ بھی حسبۃ
اللہ۔ نہ کتابوں کی کوئی رائلٹی لی اور نہ کوئی معاوضہ۔ مصنف
عبدالرزاق جب بیروت میں طبع ہو رہی تھی تو وہاں کے ایک
دوسرے مکتبہ کے ذمے دار نے فون پر حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے
پوچھا کہ آپ کو اس کی کتنی رائلٹی مل رہی ہے۔ حضرت نے
جواب دیا کہ کچھ نہیں جب کہ مصنف عبدالرزاق گیارہ جلدوں
میں چھپی ہے اور اس کی ایک جلد کی رائلٹی کی رقم لاکھوں روپیوں
سے متجاوز تھی۔ اس پر وہ صاحب مبہوت اور حیرت زدہ رہ
گئے۔" (ماہنامہ الفرقان، اپریل ۱۹۹۲ء ص:۴۶)

ڈاکٹر عبدالمعید تحریر فرماتے ہیں:

"اتنا بڑا شخص ہم لوگوں کے بیچ زمانۂ دراز تک زندہ رہا۔ نہ ہم لوگ
ٹھیک سے ان کو پہچان ہی سکے اور نہ ہندوستان میں ان کے عالی
مقام کے اعتبار سے قدر دانی ہو سکی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی قریب اور اس کے پہلے بھی بہت
سے لوگوں نے علم حدیث کی اہم خدمات انجام دی ہیں لیکن

حافظ ابن حجر عسقلانی (ف:۸۵۲ھ) کے بعد محدث اعظمیؒ نے اس علم شریف کی جو خدمت انجام دی ہے ایسی ٹھوس خدمت پورے عالم میں صدیوں کے بعد انجام پائی ہے۔ وہ کتابیں جو کبار علما و محققین کی دسترس سے باہر تھیں ان کتابوں کو ایڈٹ کر کے، ان کی تصحیح، تعلیق اور تحقیق کے بعد شائع کرنا حضرت امام اعظمی کا وہ تجدیدی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ بجا طور پر ''مجدد فی الحدیث'' کہے جانے کے مستحق ہیں۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص:۲۰۸)

مولانا مجیب اللہ ندوی اپنے مضمون ''بزم علم و فضل کی ایک شمع فروزاں گل ہوگئی'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا کی ذات نہ صرف علومِ دینیہ اور فنِ حدیث میں سند کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی ذاتِ گرامی سے ہندوستان میں بزمِ علم و فضل کی آبرو قائم تھی...... حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بعد مولانا اعظمی کی دوسری شخصیت تھی کہ اپنے غیر معمولی علم و فضل اور بین الاقوامی شہرت کے باوجود کسی وقت بھی اصلاحِ باطن سے اپنے کو بے نیاز نہیں سمجھا۔ واقعہ ہے کہ یہ رتبۂ بلند ہر صاحب علم کو نہیں ملتا۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص:۲۰۸)

معہد ملت مالیگاؤں کے مشہور و معروف عالم حضرت مولانا محمد حنیف ملی کہتے ہیں:

''مولانا نے حدیث کے میدان میں کوہ کنی کے ساتھ تحقیق و ریسرچ اور تعلیق و تحشیہ کی جو انمول راہ قائم کی ہے اسے تشنۂ علم اب نہ پا سکیں گے۔ تقریباً ایک صدی پر مشتمل شکست ناآشنا

زندگی نے جو روشنی اپنی کاوشوں سے اس امت کو عطا کی ہے اس سے علما اور اربابِ فضل قیامت تک بے نیاز نہیں ہو سکیں گے۔ مولانا کی علمی، دینی اور تعلیمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی ذات میں علم و معرفت، ایثار و قربانی، تحقیق و ریسرچ اور درس و تدریس کا ایک عالم آباد اور سنہری تاریخ آراستہ ہے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۲۱۴)

مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری کہتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی زندگی کے آخری آٹھ سال بھرپور علمی زندگی کے سال تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے تصانیف کے ڈھیر لگا دیے۔ صدیوں سے الجھے ہوئے مسائل پر محققانہ انداز میں کلام کیا۔ مخالفین کے دانت کھٹے کر دیے۔ غرض یہ کہ جو کام کیا لاجواب کیا۔ جو کام صدیوں میں نہیں ہو سکا تھا گنتی کے چند سالوں میں کر ڈالا۔ ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہوا۔ عہدے اور منصب بھی ملے گا۔ انھوں نے اپنا راستہ خود بنایا۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۲۲۷)

مولانا حبیب الرحمٰن ندوی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''مولانا کا محبوب ترین موضوع علمِ حدیث اور فنِ اسماء الرجال تھا۔ ان علوم پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ پورے ہند و پاک میں کوئی دوسری شخصیت آپ کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ زندگی کے تقریباً پچاس سال تک صرف علم حدیث کی آپ نے خدمت انجام

دی۔ حدیث کے پرانے ذخیروں کی تلاش میں آپ نے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کویت، بیروت، دمشق، مصر اور بحرین کا سفر کیا اور اس طرح آپ نے قدیم محدثین کی یاد تازہ کر دی جنہوں نے حدیثِ نبوی کی تلاش میں دور دراز کے اسفار کیے اور دنیا کے سامنے جو احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ ہے وہ انھیں بزرگوں کی شبانہ روز جد و جہد کا ثمرہ ہے۔ انھیں کی طرح آپ نے حدیث کے ایک ایک لفظ کی تحقیق، غریب اور مشکل الفاظ کی تشریح اور روایت کے ایک ایک راوی کے حالات میں پوری متاعِ حیات لٹا دی۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۲۳۲)

مولانا ضیاالدین اصلاحی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''مولانا کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا۔ ان کے بے شمار تلامذہ برِ صغیر میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان اور مفتی ظفیر الدین مفتی دار العلوم دیو بند بھی ہیں۔ تاہم تصنیف و تالیف کا کام بھی وہ برابر انجام دیتے رہے اور انھیں اس کا اچھا سلیقہ اور عمدہ ذوق تھا۔ حدیث و اسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ مخطوطات سے بھی انھیں بڑا شغف تھا۔ ان کا مہتم بالشان کارنامہ احادیث کی بہت سی ان نادر کتابوں کی اشاعت ہے جو مخطوطہ ہونے کی بنا پر اہلِ علم کی دسترس سے باہر تھیں۔ مولانا نے ان کو ان کے مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ، تصحیح و تعلیق اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کر کے اصحابِ علم و تحقیق پر بڑا احسان کیا۔ انھوں نے جن

کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے۔ ان پر عالمانہ مقدمے بھی لکھے ہیں
جن میں مصنف کے حالات و کمالات کے علاوہ ان موضوعات
پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتاب کا تذکرہ کر کے زیر
اشاعت کتاب کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے۔'' (ماہنامہ
معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۹۲ء)

مولانا محمد ظفیر الدین مفتی دارالعلوم، دیوبند ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی تنہا تھے مگر پوری اکیڈمی کا کام
انجام دیا کرتے تھے۔ خاموش تھے مگر تلامذہ کی ایک مستقل
جماعت آپ کی درسی تقریر سے اپنے دل و دماغ کو روشن رکھتی تھی
اور خواص و عوام آپ کے عالمانہ بیان سے اپنے عقائد و اعمال کو
درست رکھتے تھے اور ان کا تعلق ربِ کائنات سے بڑا مضبوط ہوا
کرتا تھا۔ علمِ حدیث میں جن کو شغف تھا وہ آپ کو اپنا استاد تسلیم
کرتے تھے۔ خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، ہندوستان کے
ہوں یا پاکستان کے، دور دراز علماء آتے اور قیام کرتے اور آپ سے
سندِ حدیث حاصل کر کے واپس ہوتے تھے۔ کسی کا کوئی اشکال ہوتا
وہ پیش کرتے اور حضرت والا کی تقریر سے ان کا اشکال منٹوں
میں حل ہو جاتا تھا اور وہ خوش و خرم واپس ہوا کرتے تھے۔ آپ کو ہر
فن میں کمال حاصل تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علمِ کلام، منطق و فلسفہ،
ادبِ عربی۔ لیکن ان علوم میں آپ کو علمِ حدیث، اسماء الرجال،
جرح و تعدیل، فقہ و فتاویٰ اور ادبِ عربی سے خاص شغف تھا۔ آپ
کا نابغۂ روزگار علما میں شمار تھا۔ قوتِ حافظہ اور ذکاوت و ذہانت میں
آپ منفرد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری کتابیں آپ کے

ذہن اور دماغ میں محفوظ ہیں جن کو آپ درس کی صورت میں کبھی
پڑھا چکے تھے یا مطالعہ کر چکے تھے۔'' (مجلّہ ترجمان الاسلام،
بنارس، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء، ص:۱۳۵)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے علمی و تحقیقی کمالات اور ان کی شخصیت و کردار کے سلسلے میں مشاہیر کے جو خیالات ملتے ہیں ان سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موصوف عصرِ حاضر کے ایک جید عالم تھے۔ وہ علمِ حدیث اور فن اسماالرجال میں لاثانی ملکہ رکھتے تھے۔ اس قدر ملکہ کہ ان کے عہد میں عالمِ اسلام میں ان کا کوئی مماثل نہیں تھا۔ بلاشبہ انھوں نے علمِ حدیث کی بے لوث خدمت کی اور اسی کو اپنی پوری زندگی کا وظیفہ بنایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے بعد علمی و تحقیقی کارناموں کا ایک ایسا ریکارڈ چھوڑا جو ہمیشہ عزت واحترام سے دیکھا اور پڑھا جائے گا۔

کتابیات

اردو:

الاعلام المرفوعہ	مولانا حبیب الرحمٰن	تنویر پریس، لکھنؤ	۱۹۶۳ء
الازھار المربوعہ	مولانا حبیب الرحمٰن	عمدۃ المطابع، لکھنؤ	......
نصرۃ الحدیث	مولانا حبیب الرحمٰن	مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۳۶۰ھ
اہل دل کی دل آویز باتیں	مولانا حبیب الرحمٰن	مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۳۶۰ھ
تحقیق اہلِ حدیث	مولانا حبیب الرحمٰن	اکبر پریس الٰہ آباد	۱۹۴۳ء
رکعاتِ تراویح	مولانا حبیب الرحمٰن	تنویر پریس، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
رکعات تراویح مذیل	مولانا حبیب الرحمٰن	تنویر پریس، لکھنؤ	۱۹۶۰ء
رہبر حجاج	مولانا حبیب الرحمٰن	اکلیل پریس، بہرائچ	۱۹۶۳ء
اعیان الحجاج (جلد اول)	مولانا حبیب الرحمٰن	تنویر پریس، لکھنؤ	
اعیان الحجاج (جلد دوم)	مولانا حبیب الرحمٰن	اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد	۱۹۷۶ء
تذکرۃ النساجین	مولانا حبیب الرحمٰن	حسن پریس، مئو	۱۹۸۵ء
حیاتِ ابوالمآثر	ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی	المجمع العلمی، مئو	۲۰۰۰ء
تذکرہ علمائے اعظم گڑھ	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	جامعہ اسلامیہ، بنارس	۱۹۷۶ء
تاریخ دارالعلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	جید پریس، دہلی	۱۹۷۸ء

عربی:

انتقاء الترغیب والترہیب — احیاء المعارف، مالیگاؤں — ۱۹۶۰ء

المسند الحمیدی (دو جلد) — مجلس علمی، ڈابھیل — ۱۹۶۳ء

کتاب الزہد والرقائق — احیاء المعارف، مالیگاؤں — ۱۹۶۶ء

کتاب السنن (دو جلد) — علمی پریس، مالیگاؤں — ۶۸-۱۹۶۷ء

مجمع بحار الانوار (پانچ جلد) — مجلس دائرۃ المعارف، حیدرآباد — ۱۹۶۷ء-۱۹۷۶ء

المصنف (عبدالرزاق) (گیارہ جلد) — دارالقلم پریس، بیروت — ۷۲-۱۹۷۰ء

المطالب العالیہ — وزارت اوقاف، کویت — ۱۹۷۰ء-۱۹۷۳ء

الالبانی شذوذہ واخطاوہ — دارالعروبۃ، کویت — ۱۹۸۵ء

فتح المغیث — مطبعۃ الاعظمی، مئو — ......

تلخص خواتم جامع الاصول — مالیگاؤں — ۱۹۷۵ء

المصنف ابن ابی شیبہ (چار جلد) — مکتبہ امدادیہ، مکہ — ۱۹۸۳ء

رسائل وجرائد:

ترجمان الاسلام، بنارس (مولانا حبیب الرحمٰن نمبر) — جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء

معارف، اعظم گڑھ — اپریل ۱۹۶۳ء، مئی ۱۹۶۷ء

اگست ۱۹۶۷ء، اپریل ۱۹۹۲ء

فاران، کراچی — جنوری ۱۹۶۳ء

تجلی، دیوبند — اکتوبر ۱۹۶۳ء

برہان، دہلی — اپریل ۱۹۷۴ء